تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

عزیز حامد مدنی کی نظم میں سائنسی حسیت

محقق:

سعدیہ بتول

196-FLL/MSURDU/F16

نگران:

ڈاکٹر شیراز فضل داد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

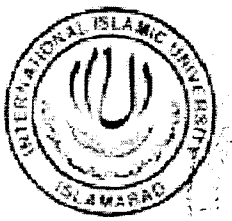

شعبہ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

TH24752.YM

MC
891.4391
ع ل

۱- اردو نظمیں -- ترقی پسندی
۲- اردو نظمیں - معاشی تجزیہ

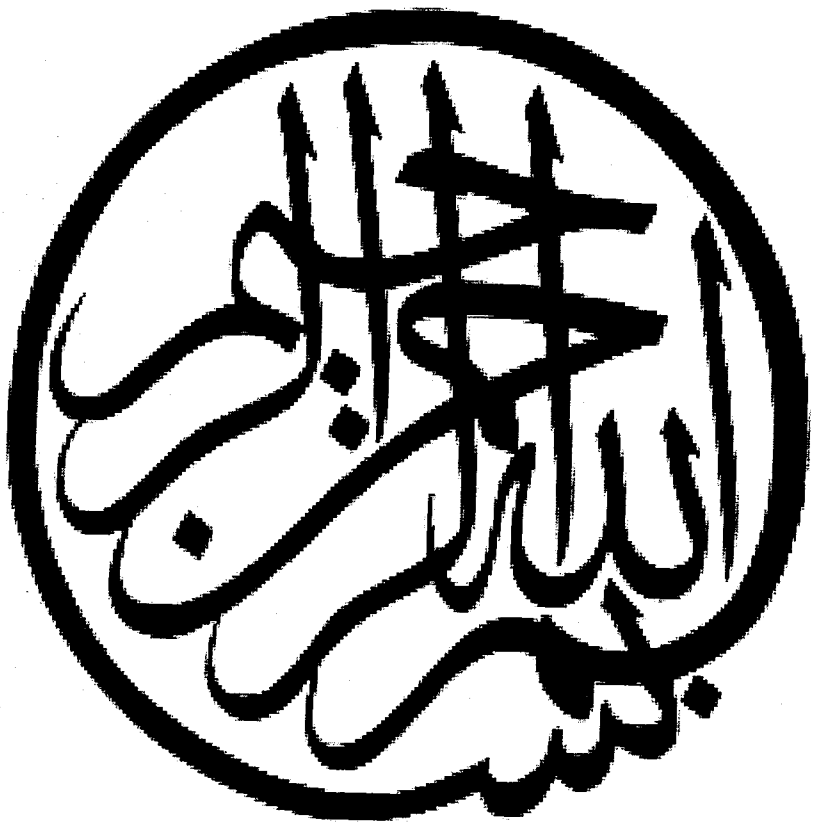

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **SADIA BATOOL**

Title of the Thesis: عزیز حامد مدنی کی نظم میں سائنسی حسیت

Registration No: **196-FLL/MSURD/F16**

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson,
Department of Urdu, Female, IIUI

External Examiner:

Dr. Abid Sial
Associate Professor
Deptt. of Urdu, NUML Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Ghulam Farida
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI

Supervisor:

Dr. Shiraz Fazal Dad
Assistant Professor
Department Of Urdu, IIUI

AG631848

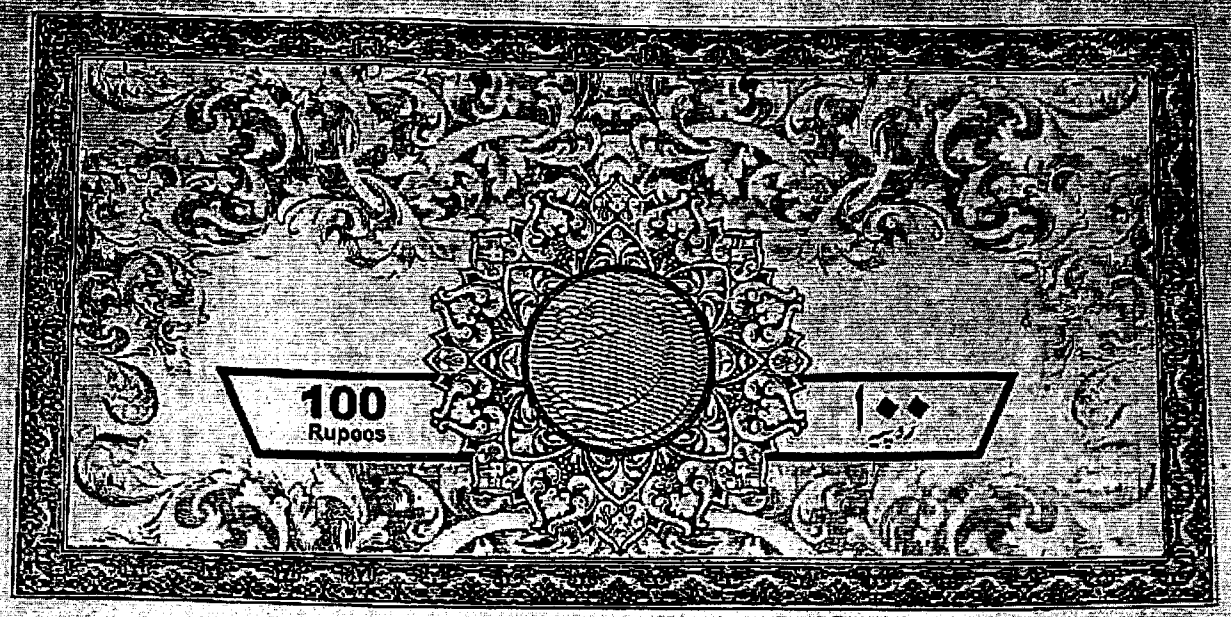

100 Rupees ۱۰۰ روپیہ

بیان حلفی

منکہ مسماۃ سعدیہ بتول دختر محمد اصغر رجسٹریشن نمبر 196-FLL/MSURDU/F16 حلفیہ بیان دیتی ہوں کہ میں نے اپنا تحقیقی مقالہ:۔

بعنوان :۔ ''عزیز حامد مدنی کی نظم میں سائنسی حسیت'' ڈاکٹر شیراز فضل داد کی زیر نگرانی اپنی محنت سے تحریر کیا ہے۔ یہ مقالہ سرقے سے پاک ہے اور اس میں تحقیق و تنقید کے اصول و ضوابط کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ نیز اس سے پہلے یہ کسی جامعہ میں برائے حصول سند پیش نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں شامل تمام حوالہ جات کا اسناد موجود ہے اور اس میں اس مقالہ کے تمام نتائج و تحقیق کی ذمہ دار ہوں۔

مندرجہ بالا بیان میرے علم و یقین کے مطابق بلکل درست ہے اور اس میں کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی گئی۔

المرقوم: 30 جنوری 2021ء

الحلفیہ	گواشد:۔
نام:۔ سعدیہ بتول	نام:۔ نائلہ جیلانی
والد کا نام:۔ محمد اصغر	والد کا نام:۔ بخشیش احمد
شناختی کارڈ نمبر:۔ 34201-3190125-8	شناختی کارڈ نمبر:۔ 37405-8352603-0
دستخط	دستخط ....
نشان انگوٹھا	

ATTESTED

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ سعدیہ بتول رجسٹریشن نمبر 196-FLL/MSURDU/F16 نے ایم۔ ایس۔ اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے تحقیقی مقالہ بعنوان "**عزیز حامد مدنی کی نظم میں سائنسی حسیت**" میری نگرانی میں رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر شیراز فضل داد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو

پیش لفظ

سب سے پہلے خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں سجدۂ شکر پیش کرتی ہوں جس نے مجھے اشرف المخلوقات ہونے کے ساتھ امت محمدیؐ ہونے کا شرف بخشا۔

اللہ رب العزت کی خاص کرم نوازی ہے جس نے مجھ کم فہم کو اس قابل بنایا اور میں اپنے ایم فل کے تحقیقی مقالے کو تکمیل تک پہنچا سکی۔

ایم۔اے اردو کرنے کے بعد ایم۔فل کی خواہش نے شدت اختیار کر لی اور دل نے عزم کیا کہ اپنی پڑھائی کے سلسلے کو جاری رکھوں گی۔ کیوں کہ میں اپنے خاندان کی واحد لڑکی ہوں جو یونی ورسٹی تک پڑھنے آئی تھی۔ میرے لیے یہ مرحلہ انتہائی دشوار تھا۔ بہر حال، اللہ پاک کی مدد سے اور میرے اساتذہ اور پیاروں کی دعاؤں سے میرا ایم۔فل میں داخلہ ہو گیا۔ کورس ورک کے بعد موضوع کے انتخاب کا مرحلہ پیش آیا۔ میری خواہش تھی کہ میں شاعری پر کام کروں۔ اس سلسلے میں میری شفیق اور نرم خو استاد محترمہ شیراز فضل داد نے میری بھرپور رہنمائی کی اور ان کی زیر نگرانی میں نے اپنے تحقیقی مقالے کا آغاز کیا۔ خاکے کی تیاری سے لے کر اس کے مکمل ہونے تک میری نگران محترمہ شیراز فضل داد نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور خاکے میں ہونے والی اغلاط کو درست کیا۔

تحقیقی مقالہ نگاری ایک مشکل اور، صبر آزما مرحلہ ہے۔ شادی کے بعد میں راولپنڈی سے گجرات منتقل ہو گئی۔ وہاں مواد کو جمع کرنے میں کافی دِقت محسوس ہوئی۔ لائبریریوں میں اس سطح کا کام نہیں تھا جو مجھے اپنے تحقیقی مقالے کے لیے درکار تھا۔ پھر ان دشوار گزار رستوں سے اللہ پاک کی مدد اور اپنی استاد محترمہ شیراز فضل داد کے تعاون سے گزر کر منزلِ مقصود تک پہنچی۔ میری نگران نے کتب کی فراہمی اور مواد کو اکٹھا کرنے میں میری بہت مدد کی۔ اللہ پاک ان کو دنیا و آخرت کی کامیابیوں سے نوازے۔ آمین!

تحقیق کے دوران جن اساتذہ، دوستوں اور گھر والوں نے میری ہر قدم پر رہنمائی کی اور مجھے حوصلہ دیا، ان کی میں عمر بھر شکر گزار رہوں گی۔ کیوں کہ مواد کی عدم دستیابی سے میں دل برداشتہ ہو جاتی تھی۔ لیکن رب ذوالجلال نے ہر طرح میری مدد کی اور ذہن و فکر کی گتھیوں کو سلجھایا۔

زیر نظر تحقیقی مقالہ درج ذیل ابواب پر مشتمل ہے:

باب اوّل: اس باب کا عنوان "سائنس اور ادب کا باہمی رشتہ" ہے۔ اس میں سائنس اور ادب دو مختلف رجحانات رکھنے والے شعبوں کا ایک دوسرے سے تعلق بتایا گیا ہے۔ سائنس ایک منطقی طریقہ کار ہے، تجربے اور مشاہدے کی

کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ جب کہ شاعری (ادب) انسانی تخیل، جذبات، اقدار و روایات اور حالات واقعات کو موزوں انداز میں پیش کرتی ہے۔ دونوں گروہ مختلف ہونے کے باوجود کس طرح ایک دوسرے سے متصل ہیں، اس باب میں ان نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوم: باب دوم "عزیز حامد مدنی بحیثیت نظم نگار" ہے۔ اس باب میں مدنی کی نظم نگاری اور شاعری کی خصوصیات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ان کی معاصر فکر کس طرح شاعری میں ابھر کر سامنے آتی ہے، اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب سوم: یہ باب "عزیز حامد مدنی کا سائنسی ایجادات پر رد عمل" ہے۔ اس میں سائنس و ٹیکنالوجی اور جدید ایجادات کی بدولت ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا جائے گا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے کس طرح ہماری تہذیب کو متاثر کیا ہے، اس کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

باب چہارم: اس باب کا عنوان "عزیز حامد مدنی کی نظم میں سائنسی اصطلاحات" ہے۔ اس میں مدنی کی نظموں میں موجود سائنسی اصطلاحات کو اکٹھا کیا گیا ہے اور ان کی وضاحت کی گئی ہے۔

درج بالا چار ابواب کے بعد ماحصل لکھا گیا ہے جس میں تحقیق سے حاصل ہونے والے ممکنہ نتائج پیش کیے گئے ہیں۔ اس باب میں مباحث کو سمیٹ دیا گیا ہے۔ ابواب کے اختتام پر حوالہ جات اور کتابیات لکھی گئی ہیں۔

اس مقالے کی تکمیل پر سب سے پہلے اس پروردگار کی شکر گزار ہوں جس نے مجھے اس مقام تک پہنچایا، حالاں کہ نہ میری زبان اس کی اہل اور نہ میرے عمل اس قابل ہیں کہ اس ذات کی مہربانیوں کا شکر ادا کر سکوں۔ میری تحقیق علم ادب کے قلزم میں ایک قطرہ بھی ثابت ہو تو میں اسے پانی زندگی حاصل سمجھوں گی۔ میرے رب کے احسانات اور کرم نوازی کی انتہا کہ میں اتنی کٹھنائیوں اور دشواریوں سے گزر کر تحقیقی مقالے کو تکمیل تک لا سکی۔ اس مقالے کی سب سے بڑی دشواری میری بڑی بہن عالیہ بتول کی ناگہانی موت اور میرے بیٹے کی علالت تھی جس کی وجہ سے تحقیقی مقالے کو تکمیل تک پہنچانے میں کافی وقت لگ گیا اور کچھ زمینی فاصلوں نے اس مشکل میں اضافہ کیے رکھا۔ بہر حال اب میں اپنی تحقیق کو مکمل کر چکی ہوں۔ میں تمام اساتذہ محترمہ نجیبہ عارف، محترمہ حمیرا اشفاق، محترمہ سائرہ بتول، محترمہ، صباحت مشتاق، محترمہ بی بی امینہ اور بالخصوص اپنی نگران محترمہ شیراز فضل داد کی دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی کی اور محبت و شفقت کا روّیہ رکھا۔

میں محترم قاسم یعقوب، صاحب کی نہایت شکر گزار ہوں جنھوں نے مواد کے حصول میں بارہا میری مدد کی۔

میں اپنی تمام دوستوں بالخصوص نائلہ جیلانی کی سپاس گزار ہوں جس نے ہر قدم پر میرا ساتھ دیا۔ جہاں میں ڈگمگائی وہاں مجھے سنبھالا، میری ہمت بڑھائی، مجھے حوصلہ دیا اور تحقیق کے اس سفر میں پیش آنے والے مسائل کو حل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ محترمہ عاصمہ نذیر کی نہایت شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر موقع پر میری مدد کی اور تحقیقی مقالے کو تکمیل تک پہنچانے میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔

زندگی مسلسل روانی کا نام ہے جس میں خوشیوں اور غموں کا ایک لازوال سلسلہ ہے۔

اس سلسلے کی ایک خوب صورت کڑی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونا ہے۔ یہاں میں اپنے شریکِ حیات اعجاز حیدر کی دل کی گہرائیوں سے سپاس گزار ہوں جنھوں نے شوہر ہونے کے ساتھ ایک مخلص دوست ہونے کا کردار بھی بہ خوبی نبھایا۔ میں اپنے بیٹے محمد حذیفہ حیدر کی بھی شکر گزار ہوں جس نے مقالے کی تیاری کے دوران مصروفیت کی وجہ کے باعث میری بے توجہی کو برداشت کیا۔ میں اپنے تمام عزیز و اقارب اور دوست احباب کی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری ہمت بڑھائی، مجھے حوصلہ دیا اور جہاں جہاں مجھے مدد کی ضرورت پیش آئی، آگے بڑھ کر میرا ساتھ دیا اور دعاؤں میں مجھے یاد رکھا۔

سب سے زیادہ سپاس گزاری کے حق دار میرے والدین ہیں جنھوں نے مجھے اس مقام تک لانے کے لیے میری تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ وہ اس جہانِ فانی سے چلے گئے ہیں لیکن ان کا ساتھ اور دعا مجھے ہر لمحہ اپنے ساتھ محسوس ہوتی ہے۔ میں اپنے رب کی بے حد شکر گزار ہوں جس نے مجھے اتنا پیار کرنے والے لوگوں سے نوازا۔ اللہ پاک ان کی محبتوں کا سایہ مجھ ناچیز پر تادیر قائم رکھے۔ آمین الٰہی آمین!

سعدیہ بتول

جون ۲۰۲۱ء

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	باب اوّل:	
	ادب اور سائنس کا باہمی رشتہ	۱
۲۔	باب دوم:	
	عزیز حامد مدنی بحیثیت نظم نگار	۲۴
۳۔	باب سوم:	
	عزیز حامد مدنی کی نظم میں سائنسی ایجادات پر رد عمل	۴۹
۴۔	باب چہارم:	
	عزیز حامد مدنی کی نظم میں سائنسی اصطلاحات	۷۵
	ماحصل	۹۳
	کتابیات	۱۰۰

باب اوّل:

ادب اور سائنس کا باہمی رشتہ

باب اوّل:

ادب اور سائنس کا باہمی رشتہ

ادب انسانی زندگی کے شعور کا نام ہے اور ایک صحت مند معاشرے میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیبوں، شاعروں اور ادبی شخصیات کو معاشرے میں ایک اہم مقام حاصل ہوتا ہے۔ ادب معاشرے اور سماج کے دست بستہ رازوں کو دامنِ دل میں سمیٹ کر انسانی جذبات و خیالات کا ترجمان بنتا ہے اور اپنے عہد کے تہذیبی و سماجی مسائل کا ہم راہی بن کر زندگی کے حقائق کو بیان کرتا ہے۔

مجنوں گورکھ پوری اپنی کتاب ادب اور زندگی میں ادب کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ادب کا صحیح مفہوم اس کی لغت میں مضمر ہے۔ ادب ہماری اس زندگی کی علامت ہے، جس کو سماجی زندگی کہتے ہیں۔ ادب کے معنی ہیں سب سے مل جل رہنے کا سلیقہ اور ادب یعنی لٹریچر اسی سلیقے کا غیر شعوری نتیجہ ہوتا ہے۔[1]

یعنی ادب کا زندگی اور سماج سے ایک گہرا تعلق ہے۔ یہ تعلق معاشرتی زندگی کی تشکیل میں بھرپور کردار ادا کرتا ہے۔ ادب میں خوش اسلوبی، تعظیم، تمیز، لحاظ، شائستگی اور تہذیبی و سماجی زندگی سے جُڑے تمام اجزا موجود ہوتے ہیں۔ ادب تہذیبی و سماجی زندگی کا بہترین نقاش ہوتا ہے۔ تہذیب میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کا حیاتِ انسانی سے کوئی نہ کوئی تعلق ہوتا ہے۔ ریت کے ذرے سے لے کر ایٹم بم تک تہذیب کے اجزا پھیلے ہوئے ہیں۔ جدید تہذیب کے ذریعے جہاں مادی اشیا اور آلات میں اضافہ ہوا ہے، وہیں انسانی فکر اور ثقافت پر بھی اس کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں۔ جدید تہذیب کی خصوصیات میں معاشرتی ساخت، ثقافت، ٹیکنالوجی، شہروں کی ترقی، باہنر افراد اور رہن سہن کے طریقے ہیں۔ جدیدیت کی عمارت انھی ستونوں پر قائم ہے۔ ادب تہذیبی و ثقافتی زندگی کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مجنوں گورکھ پوری لکھتے ہیں:

> شاعر یا ادیب جو کچھ کہتا ہے وہ ایک اندرونی تحریک یا اپج سے کہتا ہے جو دراصل ان خیالات و میلانات کا غیر شعوری نتیجہ ہوتی ہے جن کو مجموعی طور پر نظامِ معاشرت یا سماج کہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مختلف زبانوں میں اتنے ادبیات پیدا نہ ہوتے اور آج 'تاریخِ ادب' ایک بے معنی اصطلاح ہوتی۔۔۔ زندگی کے ساتھ ساتھ ادب بھی بدلتا جارہا ہے اور دور بہ دور اور درجہ بہ درجہ ترقی کر رہا ہے۔ یہ دلیل اس بات کی ہے کہ ادب کو زندگی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

جیسی زندگی ہو گی ویسا ہی ادب ہو گا اور اگر ایسا نہیں ہے تو ادب اپنے منصب کو بھولا ہوا ہے اور وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں، اس لیے کہ وہ غیر تاریخی ہے۔ (۲)

ادبی روایت تاریخ کا حصہ ہوتی ہے۔ اور ملک و قوم کے بدلتے ہوئے خیالات و رجحانات کی مسلسل، صورت گری میں اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ دنیائے ادب کا تاریخی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام شعبہ ہائے زندگی کی طرح ادب بھی ایسے حالات و اسباب کے ذریعے وجود میں آیا جسے نظامِ معاشرت کہتے ہیں۔ اپنے زمانے اور ماحول کے مطابق جن احساسات و جذبات کے گھیرے میں انسان یکتا رہا وہ ادب میں شامل ہوتے گئے۔ کیوں کہ جیسی معاشرت ہو گی، جیسا ماحول ہو گا انسانی فکر اور تخیل اسی دھارے میں بہنے لگے گا اور پھر ویسا ہی ادب تخلیق ہو گا۔ انسانی تہذیب اور ادب کے قدیم دور کے حوالے سے مجنوں گورکھ پوری رقم طراز ہیں:

> انسانی تہذیب کا قدیم دور وہ ہے جب انسان، صرف دہشت و اضطراب کے عالم میں رہتا تھا جب کہ نظامِ کائنات کی ہر وہ چیز جو دلوں میں خوف یا حیرت پیدا کرتی تھی۔ دیوی یا دیوتا سمجھی جاتی تھی۔ اس دور کو 'پر دہت کال' یا 'دورِ کہانت' کہتے ہیں۔ اس دور میں اوّل تو تحریر کا وجود ہی نہیں تھا۔ قدرت کے بے شمار عناصر کو دیوی اور دیوتاؤں سے تعبیر کر کے ان کی شان میں بھجن یا گیت بنائے جاتے تھے، وہ سینہ بہ سینہ چلتے تھے۔ اس دور کی ادبی خدمات یہی بھجن اور گیت ہیں۔ (۳)

انسان صدیوں سے جس تہذیب اور ماحول میں پرورش پا تا رہا ہے وقت کے ساتھ اس میں بے شمار تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں اور وہ فکری سطح پر مختلف ارتقائی مراحل سے گزرا۔ جس کا اولین اظہار دیومالائی ادب میں ملتا ہے۔ بنی نوع انسان نے روزِ اول ہی سے اس کائنات کو سمجھنے اور، صحیح معنوں میں اس کی تفہیم کی شعوری کوشش کی اور تخلیقِ کائنات کے بارے میں غور و خوص سے کام لیا ہے۔ اسی لیے انسانی ذہن میں مختلف سوالات گردش کرنے لگے کہ یہ کائنات کیا ہے؟ اس کی حدود کیا ہیں؟ یہ کب، کیسے اور کیوں بنی؟ زمان و مکان کیا ہیں؟ زمین و آسمان کی وسعتیں کس لیے ہیں؟ انسان کا اس کائنات اور اس سے جُڑی تمام اشیا سے کیا تعلق ہے؟ الغرض ایسے بے شمار سوالات تھے جن کو حل کرنے کی کوشش میں مصروفِ عمل رہا۔ کائنات کا فہم و ادراک حاصل کرنے کی ابتدائی کوششوں کے سبب دیومالائی ادب تخلیق ہوا۔ یہ ادب انسانی فکر کے ارتقائی مراحل کو واضح انداز میں بیان کرتا ہے۔ غلام عباس اپنے مقالے جدید اردو نظم اور تصورِ کائنات میں دیومالائی ادب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> عالمی کلاسیکی ادب کی یہ دیومالائی کہانیاں بظاہر صد رنگ ہیں مگر حقیقت میں ان کا ایک ہی رنگ ہے۔ جو قدرت کی نیرنگیوں اور رازوں سے پردہ ہٹانے کی کوششوں میں سرگرداں انسان کی کہانی ہے۔ سومیری اور بابلیوں کی گل گامش

کی داستاں ہو یا مصریوں کے غرقاب سفینہ ملاح، یونانی ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی ہو یا لاطینی شاعر ورجل کی اینیڈ، کیلیٹس کی فنجل اور ٹیورا ہو یا سیکنڈے نیویا کی والسونگا ساگام جرمنوں کی رزمیہ نی بی لنگ اینڈ لینڈ ہو یا فن لینڈ کے کلے ولا، آرتھر اور شارلیمانی رومانز ہوں یا جزیرہ نما سپین کی رزمیہ ایمیڈس ڈی گال، چینی و جاپانی اساطیر ہوں یا ہندوستانی رزمیہ مہابھارت اور رامائن یا ایران کا شاہ نامہ فردوسی۔ بظاہر یہ ہمیں مختلف خطوں، نسلوں اور تہذیب سے متعلق نظر آتی ہیں تاہم ہیت، موضوع اور مواد کے اعتبار سے سب ایک ہی نوعیت کی ہیں۔ یہ تمام تر کہانیاں جہاں انسان کی ذہنی ترقی کو تاریخی تناظر میں سمجھنے میں معاون ہیں۔ وہیں یہ انسان اور کائنات کے رشتوں کی بھی وضاحت کرتی ہیں۔ (۴)

یہ دیومالائی قصے کہانیاں انسان کے شعوری سفر کی وہ علامتیں ہیں جنھوں نے کائنات کے وسیع سمندر میں انسان کا اپنے خالق سے رشتہ استوار کرنے کے ساتھ انسان کی حیثیت کو واضح کیا ہے۔ اس زمانے میں انسان کا شعور، صرف اپنی ذات تک محدود تھا لہٰذا اساطیری کرداروں کی شکل وصورت اطوار وعادات کافی حد تک انسانوں سے مماثل تھے۔ انسانی رویے اور کیفیات جیسے محبت، نفرت، خوشی، غم وغصہ کا اظہار بھی دیوی دیوتاؤں کے کرداروں میں نظر آتا تھا۔ جو اس بات کی دلیل تھا کہ اس زمانے کا انسان فکر وشعور کے راستے پر گامزن تھا۔ اساطیر کی جمالیات میں شکیل الرحمان رقم طراز ہیں:

اساطیری کردار وواقعات انسان کی سائیکی سے بہت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے انسان کے ابتدائی تخلیقی ذہن اور اس کی جمالیاتی کیفیات کو بہت حد تک سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ (۵)

وقت گزرنے کے ساتھ انسان کے عقل وشعور کے میدان میں قدم رکھا، مختلف علوم سے آگہی حاصل کی اور کائنات میں پھیلی اشیا کو تحقیقی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ کائنات اس کی سوچ کا محور بن گئی۔ وہ حقیقت کا ادراک حاصل کرنے کی سعی کرنے لگا اور تفہیم کائنات کے لیے مختلف رویے اپنائے گئے۔ غلام عباس لکھتے ہیں:

فلسفہ کے مطابق انسان نے اپنے طور پر کائنات کو سمجھنے کی کوشش میں دو بنیادی رویے اپنائے؛ عقلی اور غیر عقلی۔ عقلی رویوں کا تعلق استدلال سے ہے۔ جہاں تمام چیزوں کو علل ومعلول کے حوالے سے پرکھنے کا ڈول ڈالا گیا۔ جب کہ غیر عقلی رویوں میں وہ تمام نظریات شامل ہوگئے جنھیں بغیر سوچے سمجھے، صرف اس بنا پر اختیار کر لیا گیا کہ وہ روایات کی، صورت نسل در نسل منتقل ہوتے رہے۔ غیر عقلی رویے توہمات، دیومالا اور مذاہب کی صورت میں سامنے آئے جن میں کسی چیز کو محض اجداد کی نسبت مان لیا گیا۔ (۶)

رفتہ رفتہ انسانی تاریخ نے رُخ بدلا۔ یہ تاریخ پتھر، لکڑی اور دھات کے زمانوں سے نکل کر ارتقائی سفر طے کرنے لگی۔ اس سفر میں انسان مصائب و مشکلات کی گھاٹیوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھنا لگا۔ اس دوران اس کی فکری نشوونما بھی ہوئی اور ماحول میں بھی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ موجودہ دور کا انسان عہد قدیم کے انسان کی طرز زندگی، معاشرت، فکری رویوں اور حالات کو آج کے دور کے انسان سے ملاتا ہے تو حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ کس طرح انسان نے عقل و استدلال اور شعور کو استعمال میں لاتے ہوئے غاروں سے نکل کر جدید طرز معاشرت تک سفر طے کیا۔ زندگی اور کائنات کے تمام جملہ امور کا فہم حاصل کیا۔ راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کا سدباب کرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔ اپنے مضمون سائنس اور ادب میں عمران اختر لکھتے ہیں:

> سائنسی طرز فکر ایک انسان اور معاشرے کو سراب سے نکال کر متحارب (ILLUSION) اور مستحکم قوت عطا کرتی ہے۔ جب کہ مادی جدلیات اور انسانی فکر و فہم معاشرہ کے لیے زندگی کے بنیادی اسباب پیدا کرنے کا موجب بھی ہے۔ تصور کائنات ایک بنیادی اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اور تمام کائنات عقل، وجدان اور تخیل کا سہارا لے کر تخلیقی عمل جیسے کٹھن مرحلے سے گزرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ (۷)

عصر حاضر میں ہونے والی ترقی نے انسان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ہر شے کو تجربے کی کسوٹی پر پرکھنے کے قابل ہو گیا اور مختلف علوم میں مہارت حاصل کی جن میں سیاسیات، نفسیات، عمرانیات، منطق، الہیات، ریاضی، کیمیا، حیاتیات، طبیعیات اور سائنسی علوم شامل ہیں۔ ان میں ہر علم کی مزید شاخیں ہیں جس نے انسانی فکر کو بلندیوں پر پہنچا دیا ہے۔ ان تمام علوم و افکار اور معاشرتی زندگی کے گہرے اثرات ہمیں ادب میں بہت نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ دیگر علوم کی نسبت ادب ہر لحاظ سے منفرد ہوتا ہے کیوں کہ وہ تمام علوم تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ادبا اور ناقدین نے ادب کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں:

نارمن جودک کے مطابق:

> ادب مراد ہے اس تمام سرمایہ خیالات و احساسات کی جو تحریر میں آچکا ہے اور جسے اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو مسرت ہوتی ہے۔ (۸)

ادب احساسات و جذبات کا وہ سمندر ہے جس کی لہریں اتنی روانی اور دل کشی سے قلبِ انسانی کو اپنے حصار میں لے لیتی ہیں کہ قاری مسرت و انبساط کے احساس سے پوری طرح سرشار ہو جاتا ہے۔ ادبی تحریریں اس لیے بھی مسرت

آمیز ہوتی ہیں کہ وہ انسانی جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ پڑھنے والے کے دل میں جو بات چھپی ہوتی ہے اور جو وہ محسوس کرتا ہے، اس کا اظہار ادب میں نظر آتا ہے۔ کارڈینل نیومن لکھتا ہے:

انسانی افکار، خیالات اور احساسات کا اظہار زبان اور کے ذریعے ادب کہلاتا ہے۔[۹]

ادب کے ذریعے ہم زندگی کا نظارہ کرتے ہیں۔ ادب کے اظہار میں زبان کی اہمیت مسلّم ہے۔ انسانی فکر و خیال زبان اور الفاظ کے ذریعے ہی ادب کا حصہ بنتا ہے۔ جذبات و احساسات کے بیان میں الفاظ کی ترتیب اہم کردار ادا کرتی ہے۔ الفاظ کا چناؤ جس قدر موثر ہو گا، ادبی تخلیق اس قدر معیاری اور بہم مسرت پہنچانے والی ہو گی۔

میکسم گورکی ادب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

ادب انسانیت کا نقاد ہے۔ وہ اس کی کج روی کو ظاہر کرتا ہے اور اس کی خام کاریوں کو بے نقاب کرتا ہے اور اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انسان کی حیات مستعار کو دائم و قائم بنائے۔ ادب کی بے کل اور تڑپ اس لیے ہے کہ آدمی کو سمجھائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں بلکہ حالات اس کے غلام ہیں وہ آدمی کو بتلانا چاہتا ہے کہ وہ آپ اپنی زندگی کا مالک ہے اور اسے جس روش پہ چاہے لے جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ادب تغیر پسند، قدامت شکن اور دورِ جدید کا پیش رو ہے۔[۱۰]

میکسم گورکی کو جدید ادب کا پیش رو کہا جاتا ہے۔ اس کے خیال میں وہی ادب عروج تک پہنچتا ہے، جو حیاتِ انسانی کو اپنے زمانے اور آنے والے زمانوں کے لیے امر کر دے۔ ادب میں خود مختاری کی، صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ وہ معاشرتی انحطاط اور انسانی رویوں کے ظاہر و باطن کو بے نقاب کرتا ہے۔ وہی ادب آفاقی کہلاتا ہے جس میں عصری تقاضوں کے مطابق تبدیل ہونے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ پروفیسر احمد سجاد اپنی تصنیف تعمیری ادبی تحریک میں ادب کے بارے میں لکھتے ہیں:

ادب کی حیثیت ایک معاشرتی ادارے کی سی ہے۔ کیوں کہ اس کا میڈیم زبان ہے اور زبان ایک معاشرتی تخلیق ہے۔ اس لیے یہ ادارہ، صرف معاشرتی عمل کی جھلک پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کی روح کو جذب کر کے خود بھی اپنے عہد کی روح اور اس کا خلاصہ بن جاتا ہے۔ یوں یہ معاشرہ اس کی روایات اور ثقافت کا مکمل، موزوں اور حسین اختصار بن جاتا ہے۔[۱۱]

طارق سعید اپنی کتاب اردو ادب کا تہذیبی پس منظر میں ادب کے حوالے سے لکھتے ہیں؛

ادب میں متحرک کرنے اور ہماری روح میں موجود خفیہ، صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی غیر معمولی، صلاحیت ہوتی ہے۔ ادب کے ذریعے ہم زندگی کا شعور حاصل کرتے ہیں اور یہ ادب کا خاص منصب ہے۔[۱۲]

ادب سماجی زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اپنے عہد کے تہذیبی و سماجی مسائل اور پیچیدگیوں کو بیان کرنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ ادیب اپنے عہد کے نمایاں رجحانات و میلانات کو اپنی تخلیقات کا حصہ بناتا ہے۔ وہ ایسے موضوعات پر تحریریں قلم بند کرتا ہے جو عصری تقاضوں کے مطابق ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر عبد الباری اپنی تصنیف لکھنو کا معاشرتی اور ثقافتی پس منظر میں رقم طراز ہیں:

> ایک ادیب یا مصنف جو ذہنی زاویے مشاہدہ بیاں فکر آور نتائج کے مراحل میں اختیار کرتا ہے۔ دراصل ثقافت کے انداز (Pattern) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ (۱۳)

ادب اور ثقافت کا عمیق تعلق ہی ادب کی تخلیق کے لیے بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ شعر و ادب کو تہذیب و ثقافت اور سماجی زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تہذیبی و ثقافی زندگی ادب کی پہچان ہوتی ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کے فنی نمونے ان کے زمانے کی سماجی زندگی اور ثقافت کے علمبردار ہوتے ہیں۔ اردو کی ترقی پسند تحریک میں نجیب جمال اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

> تخلیقی ادب اپنے زمانے کی تاریخ ہی نہیں لکھتا بلکہ زمانے کی پشت پر اپنے دستخط بھی ثبت کرتا ہے اور جس طرح باجا راگ سے بھرا ہوتا ہے، اسی طرح فن کار کے دل میں بھی اشکوں کا جوش تہیہ طوفاں کیے ہوتا ہے اور وہ زمانے کی کروٹوں، سماج کی حقیقتوں سیاست کی بوالعجبیوں، اخلاقیات کی پابندیوں، حسن کی شوخیوں اور عشق کی گرمیوں کو بیان کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ (۱۴)

ادب کسی بھی زبان کا ہو، اپنے عہد کے غالب رویّوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ خواہ وہ رویے سماجی ہوں، سیاسی ہوں، تہذیبی ہوں، ثقافتی ہوں یا جدید سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی کے زیر اثر پروان چڑھتے ہوں۔ ادب میں تجربے کے اظہار کا دائرہ کار جتنی وسعت اختیار کرے تاریخ و تہذیب سے مکمل دوری اختیار کرنا ممکن نہیں۔ ہر ادب پارہ شاعر و ادیب کی شخصیت اور عصری شعور کا عکاس ہوتا ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ کوئی تخلیق کار اپنے معاشرے میں عصری تقاضوں کی بدولت ہونے والے تغیرات سے متاثر نہ ہو۔ زندگی میں آنے والی تبدیلیاں ادب میں بھی منعکس ہوتی ہیں۔ زندگی جتنے رُخ بدلتی ہے، ادب بھی اسی مزاج و انداز سے اپنے رنگ اور آہنگ بدلتا ہے۔ تہذیبی و ثقافتی، معاشی و معاشرتی، سیاسی و سماجی اور سائنسی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں میں اپنا مقام متعین کرتا ہے۔ مجنوں گورکھ پوری ادب اور زندگی میں عصرِ حاضر کے ادب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

آج محض حسن کاری کو ادب نہیں کہتے۔ ادب اگر ملک اور زمانے کے تازہ ترین فکریات یعنی اجتماعی خیالات و افکار کے حامل نہیں تو، صحیح معنوں میں وہ ادب نہیں ہے۔ اب یہ حقیقت روشن ہو چکی ہے کہ حسن، خیر اور حقیقت کو ایک آہنگ بنا کر پیش کرنے کا نام ادب ہے اور سب سے بڑا ادیب وہ ہے جو بیک وقت ہمارے ذوقِ حسن، ذوق، فکر اور ذوقِ عمل کو نہ، صرف آسودہ کرے بلکہ حرکت میں لائے۔ اب خیالِ حسن اور حسنِ عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ادبیات کے بے غرج و غایت ہوتے ہوئے بھی غایتی ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک دبے ہوئے غایتی میلان (PuposeBais) کا ہونا لازمی امر ہے۔[15]

درج بالا بحث سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ادب انفرادی اور اجتماعی سطح پر انسانی شعور کو متاثر کرتا ہے۔ اور سماج میں تربیت گاہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ معاشرتی، صحت اور کردار کی تشکیل میں ادب کے مثبت کردار کو کسی، صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ادب میں نہ، صرف زندگی کی تفسیر بلکہ تنقید کا مظہر بھی پوشیدہ ہوتا ہے جو زندگی کو مقام عروج تک پہنچاتا ہے۔

ادب اور سائنس:

ادب کا تعلق کسی مخصوص علم یا فن سے نہیں، بلکہ مکمل زندگی سے مشروط ہے۔ جب ادب اور زندگی میں تعلق قائم ہوتا ہے تو شاعری اور نثر میں زندگی کا نمایاں رنگ بہ خوبی نظر آتا ہے۔ تاریخی مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سائنس اور ادب کا تعلق آج کا نہیں بلکہ بہت پرانا ہے۔ قدیم دور سے لے کر ادب اور شاعری کے آغاز اور اس کے بامِ عروج تک پہنچنے میں ایسی لا تعداد مثالیں سامنے آتی ہیں جو اس بات کی دلالت کرتی ہیں کہ قدیم دور کا انسان مختلف، صلاحیتوں کا مالک تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس نے کائنات کا فہم و ادراک حاصل کیا اور مختلف علوم میں مہارت حاصل کی۔ وہ بیک وقت فلسفہ، مابعد الطبیعیات، ارضیات، جغرافیہ، معدنیات، لسانیات، مذہب، تاریخ، تہذیب اور آرٹ سے واقفیت رکھتا تھا۔ سائنس دان اور قلم کار دونوں تجربات اور مشاہدات سے گزرتے ہیں، صداقت کی جستجو کرتے ہیں اور حقائق کو منظر عام پر لانے میں بھرپور جدوجہد کرتے ہیں۔ سائنس اور شاعری دو مختلف گروہوں سے تعلق رکھنے کے باوجود جابجا ایک دوسرے سے متصل نظر آتے ہیں۔ بقول لارنس گولڈ:

سائنس ہمیشہ کسی ذاتی تجربے کا ریکارڈ ہوتی ہے اور یہی بات ادب کے لیے بھی ہے۔[16]

سائنس میں تجربے یا مشاہدے سے حاصل کی گئی معلومات کو منطقی دلائل سے پرکھا جاتا ہے۔ جب کہ ادب حقیقت کو رویوں اور افکار کی روشنی میں دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ سائنس بظاہر خشک مضامین کا علم ہوتے ہوئے بھی بہت

سے حوالوں سے ادب سے منسلک نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر، صلاح الدین درویش اپنے مضمون سائنس اور ادب میں رقم طراز ہیں:

> ادب اور سائنس کا تعلق آقا اور لونڈی کا نہیں بلکہ برابری کی سطح پر دونوں ایک دوسرے کے انسان دوست کردار کو مضبوط بناتے ہیں۔ ادب سائنس کو انسانی بقا کے لیے ایک مؤثر قوت، راہنمائی اور بصیرت عطا کرتا ہے اور سائنس ادیب کو حقیقت شناس اور معاشرے کا ایک کار آمد فرد بناتی ہے۔ سائنس بالآخر ادب کی غیر حقیقی، غیر سائنسی، جامد اور تصوراتی اور خرافاتی رجحانات کے بخیے ادھیڑ دیتی ہے اور ادب، سائنس اور ٹیکنالوجی کے انسانیت کش رجحانات کے متوازی انسانی بقا کے لیے فکرِ صالح کی تشکیل کرتا ہے۔ یوں دونوں کے مقاصد کا جہاں ایک ہو جاتا ہے۔[17]

شاعری ادب کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے جو انسان کی جمالیاتی حس کو زندہ رکھنے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ انسانی فہم کے عظیم کارناموں میں زبان کی ایجاد کے بعد شاعری کی ایجاد آتی ہے۔ اظہار کے ذریعوں میں شاعری سب کے لیے کارآمد اور پُر اثر ثابت ہوئی ہے۔ سائنس اور شاعری کا دیرینہ تعلق ہے۔ ادبی تاریخ میں علوم و فنون کی ساری کڑیاں یونانی اساطیر سے جا کر ملتی ہیں۔ یونانی ادب کے مطابق سائنس اور شاعری ایک مضبوط تعلق میں جُڑے ہوئے ہیں۔ انگریزی مضمون نگار سوس شا اپنے مضمون "سائنس اور شاعری" میں لکھتا ہے:

> فی زمانہ یہ حقیقت بھی پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ سائنس اور شاعری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔[18]

شاعری کو ادبِ لطیف کہا جاتا ہے۔ اس کا شمار دنیا کے بہترین علوم و فنون میں ہوتا ہے۔ شاعری کی قدامت کی طرف نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ عالمی ادب میں نثر کے بجائے شاعری زیادہ قدیم مانی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ آسمانی کتب میں بھی شاعری کا آہنگ ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ شاعری کی قدامت کے بارے میں لکھتے ہیں:

> شاعری ایک قدیم انسانی عمل ہے۔ اس کی قدامت اس کے جواز کی دلیل ہے۔ ہر دور میں انسانوں کا اس کی طرف متوجہ ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کا تعلق انسان کی فطرتِ اولیٰ سے ہے۔ یعنی یہ اس کا فطری تقاضا ہے اور اس کے جواز کے لیے یہی امر کافی ہے۔[19]

شاعری حالات و واقعات، معاشرتی ماحول، تہذیب و ثقافت اور روایات کی عکاسی کرتی ہے۔ شاعر اپنے اشعار کے ذریعے خیالات کی وسعت کو لفظوں کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور آفاقی سچائیوں کو منظرِ عام پر لاتا ہے۔ شاعری ایک خداداد صلاحیت ہے اسی جوہر کی بدولت شاعر کا تخیل اپنے زمانے کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانوں کی خبر بھی دیتا ہے۔ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو مناسب الفاظ کا جامہ پہنا کر شعر تخلیق کرتا ہے۔ شاعر کی حسِ جمال ذہنی پختگی، باریک بینی، بلند تخیل اور الفاظ کا چناؤ پائیدار شعر کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔

ذیل میں شعر کے معنی ملاحظہ کیجیے:

شعر عربی زبان کا لفظ ہے، المنجد کے مطابق شعر کے لغوی معنی کسی کو جاننا یا محسوس کرنا ہے۔ جب کہ الشعر سے مراد منظوم اور موزوں کلام ہے۔ (۲۰)

فرہنگ آصفیہ میں شعر کو اس انداز میں بیان کیا گیا ہے:

شعر: لغوی معنی جاننا، دریافت کرنا۔ کسی باریک چیز کی واقفیت، اصطلاحی معنی وہ سخن موزوں اور مقفیٰ ہے جو بالقصد کہا جائے لیکن بعض کی رائے ہے مقفیٰ ہونے کی شرط نہیں ہے۔ جس نے عربی میں اوّل شعر کہا وہ تعرب بن قحطان ہے اور جس نے فارسی میں شعر شروع کیا وہ بہرا گو ہے۔ (۲۱)

نثار اکبر آبادی شعر کے حوالے سے اپنی تصنیف شعر اور فنِ شعر میں لکھتے ہیں:

شعر لفظ شعور سے نکلا ہے جس کے معنی کسی چیز کے جاننے پہچاننے اور واقفیت کے ہیں۔ لیکن اصطلاحاً شعر اس کلام موزوں کو کہتے ہیں جو قصداً کہا جائے۔ یہ کلام موزوں جذبات اور احساسات کے تابع ہوتا ہے اور کسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دراصل شعر ایک قسم کی لفظی مصوری ہے۔ یعنی مصور برش اور رنگ سے ظاہر کی تصویر بناتا ہے اور شاعر جذبات اور باطنی احساسات کی تصویر مناسب الفاظ میں کھینچتا ہے۔ (۲۲)

محمد ہادی فنِ شاعری کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

شاعری کی روح جو مختلف مضامین کے مادے کو الفاظ کے مختلف ہیئتی قالبوں میں ڈھال کر ان کو جلوہ گر کرتی ہے، اسے فنِ شاعری بھی کہتے ہیں، عملِ شعر گوئی بھی اور شعریت بھی۔ (۲۳)

ادیب و شاعر کی تخلیقات کے نمونے اس کا فکری اثاثہ ہوتے ہیں۔ یہ تخلیقی نمونے شعر و نثر کی، صورت میں موجود ہوتے ہیں اور اپنی تہذیب و ثقافت کے رنگوں کو، صفحہِ قرطاس پر بکھیرنے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ شاعر تخیلات کی دنیا کے باسی ہوتے ہیں اور تخیل کا یہ پودا ثقافت کی مٹی میں اگتا ہے اور تن آور درخت کی، صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایک تخلیق کار اپنے عہد کے تمام لوازم کو پوری یکسوئی کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی زبان اور انداز بیاں اس کی طبع فکر کے مطابق ہوتا لیکن علم و ادراک، تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ اردو شاعری کا مزاج میں وزیر آغا لکھتے ہیں:

کسی زبان کی شاعری کا مطالعہ اس بات کا متقاضی ہے کہ پہلے اس تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کا جائزہ لیا جائے، جس میں اس زبان اور اس کی شاعری نے جنم لیا لیکن یہ پس منظر کسی سادہ ورق کی طرح ایک ہموار سطح کو پیش نہیں کرتا۔ یہ دو مختلف سطحوں کے امتزاج سے مشکل ہوتا ہے۔ اس کی پہلی سطح دھرتی کی تاریخ کا ایک آئینہ ہے۔ یعنی یہ سطح

دھرتی کے اصل باشندوں اور باہر سے آنے والے قبائل کی باہمی آویزش سے اپنے لیے ایک خاص رنگ مستعار لیتی ہے۔ دوسری سطح داخلی اور تہذیبی تصادم کو اجاگر کرتی ہے اور زمین کے اوصاف کے علاوہ آسمان کے اوصاف کو بھی پیش کر دیتی ہے۔ ان دونوں سطحوں کے امتزاج ہی سے کسی ملک کا وہ ثقافتی اور تہذیبی پس منظر مرتب ہوتا ہے جو ان کی زبان اور شاعری پر گہرے اثرات مرتسم کرتا ہے۔ (۲۴)

کوثر مظہری لکھتے ہیں:

ادیب یا شاعر جو کچھ بھی سوچتا ہے اور اپنے دائرۂ فکر میں جو بھی خاکہ تیار کرتا ہے، اس میں معاشرے کے تہذیبی و ثقافتی عناصر کی کار فرمائی لازمی طور پر ہوتی ہے۔ (۲۵)

عہدِ قدیم سے دورِ حاضر تک جتنے بھی فکری مباحث ملتے ہیں ان سب میں ادب اور شاعری پر بحث کی گئی ہے۔ شاعری اپنی اثر پذیری کی، صلاحیت کی وجہ سے ہر زمانے میں انسان کو جذباتی و نفسیاتی سطح پر متاثر کرتی رہی ہے۔ چوں کہ شاعری کا انسان اور معاشرے سے عمیق تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری ہمیں زندگی کی گہری آگاہی عطا کرنے کے ساتھ سماج کے اتار چڑھاؤ سے آشنا کرتی ہے۔

یونانی مفکرین افلاطون اور ارسطو نے شاعری کے بارے میں اپنے اپنے نظریات پیش کیے۔ افلاطون کا نظریہ تھا شاعری فطرت کی نقل کرتی ہے۔ جب کہ ارسطو کا خیال تھا شاعری تخیل فطرت کی نقل کرتی ہے۔ یہ دونوں نظریات ایک دوسرے سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ افلاطون مقصدی شاعری یا ادب کے خلاف نہیں تھا اس کا اعتراض محض تخیلاتی شاعری پر تھا۔ افلاطون کے نزدیک شاعر مجذوبانہ شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ جب تک شاعر پر الہامی قوت کا قبضہ نہ ہو جائے، وہ اس وقت تک کوئی چیز تخلیق نہیں کر سکتا۔ وہ قدوسی طاقتوں کے زیر اثر شاعری لکھتا ہے اور دیوی و دیوتا اس کے افکار کو اپنی مرضی کے مطابق تخلیق کرتے ہیں۔ غلام عباس افلاطون کے نظریے کے بارے میں لکھتے ہیں:

افلاطون کے نظریۂ الہام کی بنیاد اس کا تصور شاعری ہے۔ کیوں کہ اس کے نزدیک شاعر ایک ایسا فرد ہے جو خیالات کی دنیا میں رہتا ہے وہ خود کچھ نہیں کہتا۔ بلکہ دیوی دیوتا اس پر افکار کو القا کرتے ہیں۔ وہ، صرف اور، صرف افکار و نظریات کو بیان کرنے والا ہے نہ کہ سوچنے والا۔ اپنے اسی رویّے کی بدولت وہ شاعر کو مثالی ریاست کے قابل نہیں سمجھتا۔ (۲۶)

اپنے مقالے اردو شعرا کا سائنسی شعور میں ڈاکٹر سعید احمد ارسطو کے شعری نظریات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

ارسطو کے نزدیک شاعر افراد کے افعال اور جذبات کو ایسے طریقے سے بیان کرتا ہے کہ وہ عمومی سے آفاقی بن جاتے ہیں اس لیے شاعری کو تاریخ پر تفوق حاصل ہے۔(۲۷)

یعنی شاعری ہی وہ شخصِ خاص ہے جو انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی اس انوکھے انداز میں کرتا ہے کہ عمومیت سے آفاقیت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ ارسطو کے خیال میں شاعری تاریخ نویسی سے زیادہ فلسفیانہ عمل ہے۔

ڈاکٹر ہادی حسین مغربی شعریات میں شیلے کے نظریہ شعریات کے بارے میں لکھتے ہیں:

شاعری ایک بالاتر فہم، الہام کے آئینے ہوتے ہیں، ان دور دراز سایوں کے آئینے ہوتے ہیں، جو مستقبل حال پر ڈالتا ہے، وہ الفاظ ہوتے ہیں جو ایسی چیزوں کا اظہار کرتے ہیں جنھیں وہ خود نہیں سمجھتے۔ وہ جنگلی نقارے ہوتے ہیں جو خود جنگ جوئی کے جذبے سے معرا ہوتے ہیں، وہ محرک ہوتے ہیں جو بغیر ہلے دنیا کو ہلا دیتے ہیں۔ شاعر دنیا کے وہ قانون ساز ہوتے ہیں جن کا اعتراف نہیں کیا گیا۔(۲۸)

ورڈزورتھ فطرت کا شاعر ہے اس کی شاعری کا پیام انسان اور فطرت کی ہم آہنگی ہے۔ شاعر کے نزدیک انسان اور فطرت دونوں ایک دوسرے کے محرم ہیں۔ مڈلے نے اپنی کتاب Science And Poetry میں سائنس کو ایک ہمہ گیر قوت قرار دیا ہے۔ شیلے کے نزدیک شاعری بہترین ذہنوں اور دلوں کے مسرت سے بھرپور لمحوں کی کہانی ہے۔

شاعری کا جواز (Defense of Poetry) کے عنوان سے شیلے ایک رسالہ بھی نکالتا تھا۔ شیلے لکھتا ہے:

ادبی فن کار کا فریضہ ہے کہ سائنس کے علم کو جذب کرے اور انسانی ضروریات کے عین مطابق متشکل کر دے۔ اس میں انسانی جذبوں کا رنگ بھرے اور اسے انسانی فطرت کے خون اور گوشت سے نئی شکل دے۔(۲۹)

سائنس:

انسانی زندگی میں سائنس کی عظمت و اہمیت روز اوّل ہی سے مسلم ہے۔ جیسے جیسے انسانی شعور نے ترقی کی انسان اپنے ارد گرد کے ماحول سے نتائج اخذ کرنے لگا۔ اس کی تلاش اور جستجو نے تسخیرِ کائنات کے دروازے کھول دیے۔ چوں کہ انسان ہمیشہ سے ہی تفہیم کائنات کی خاطر کوشاں رہا ہے اور اپنی عقل و دانش اور فہم و فراست کو بروئے کار لاتے ہوئے نت نئے انکشافات کرتا رہا ہے۔ اسی کوشش کی بدولت آج کا زمانہ سائنس و ٹیکنالوجی کا زمانہ کہلاتا ہے۔ سائنسی میدان میں انسان بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ مختلف انواع و اقسام کی تجارت ہو رہی ہے۔ انسان نت نئے تجربے کر رہا ہے۔ دنیا ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے۔ سائنس ہماری سماجی و معاشرتی زندگی کے لیے ناگزیر ہو گئی ہے۔ اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا سائنس کو یوں بیان کرتا ہے:

جاندار اور بے جان طبیعی دنیا کے متعلق منضبط علم، اسے متشکل کرنے والے طریقوں اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے روّیوں کو بحیثیت مجموعی سائنس کہا جاتا ہے۔ یوں سائنس ایک خاص طرح کی سرگرمی بھی ہے۔ سائنس کا اہم ترین جزو سائنسی طریقہ کار ہے۔ یہ، صدیوں کی کوشش سے متشکل ہوا ہے اور اب اسے مسلّمہ اور نہایت واضح مراحل و مدارج کی، صورت میں بیان کیا جاسکتا ہے۔[۳۰]

سائنس لاطینی زبان کا لفظ "سائینٹیا"(Scientia) سے نکلا ہے جس کے معنی علم کے ہیں۔ سائنس کا علم دنیا کے ٹھوس حقائق اور کائناتی انکشافات پر مبنی علم ہے۔ اس میں مختلف اشیا کا تجربات و مشاہدات کی روشنی میں مطالعہ کر کے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ نتائج کلی یا ختمی نوعیت کے نہیں ہوتے ہیں۔ جن نظریات کو ایک زمانے میں عروج حاصل ہوتا ہے۔ کچھ عرصے بعد نئی تحقیق اور دریافتیں اس نظریے کو رد کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ سائنس کی بنیاد اور جدید نظریات کو سلجھائے اور کائنات کے رازوں کو منکشف کرتے رہنے پر ہے۔ سائنس کا علم مطلق، صداقت پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ تجربات کی بنیاد پر ایک حد تک پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ سائنسی نظریات حقائق، مشاہدات اور تجربات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ آزاد دائرۃ المعارف میں سائنس کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

سائنس ایک منظم طریقہِ کار کے تحت کسی بات کو جاننے یا اس کا علم حاصل کرنے کو کہا جاتا ہے۔ سائنس میں تجربے یا مشاہدے سے حاصل شدہ معلومات کو عقلی و منطقی دلائل سے پرکھا اور جمع کیا جاتا ہے۔ سائنسی علم کی تصدیق یا تردید کے لیے تجربہ واحد کسوٹی ہے۔ ایک سائنسی تجربے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اصول و نتائج دونوں ہی بعد میں دوسرے دہرا سکتے ہوں یا ان کی تصدیق کر سکتے ہوں۔ یعنی وہ قابلِ اعادہ ہوں۔[۳۱]

سائنسی علم کی بنیاد مفروضات کی بجائے تجربات پر ہوتی ہے۔ تجربہ گاہ میں مختلف اشیا کا مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں بہ نظر غائر مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جس کے باعث نئے نظریات اور دریافتیں منظر عام پر آتی ہیں۔ سائنس کی صداقت و جرأت کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر محمود علی سڈنی فلسفہ سائنس اور کائنات میں رقم طراز ہیں:

سائنس جرات کے ساتھ پرانے ادعائی عقیدوں (DOGMATIC BELIEFS) اور رواجی روایتوں کو للکارتی اور چیلنج کرتی ہے۔ ذہن کو تحریک دیتی اور ابھارتی ہے۔ منطقی استدلال کو قائم کرتی ہے اور عقل کو جلا دیتی ہے۔ رواجی، روایتی، ادعائی تعلیم، اندھے باللغیب اعتقادات اور اسی طرح کے غیر سائنسی رویوں کی نفی کرتی ہے۔ سائنس منطقی، استدلالی طور پر سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔[۳۲]

سائنس ایک ایسا علم ہے جس میں مادے کی تمام اقسام اور ان کے خواص کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ سائنس ایک وسیع علم ہے، اس کو سمجھنے اور حقائق کا ادراک حاصل کرنے کے لیے اس کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلے پہل

سائنس کی تقسیم دو علوم کی، صورت میں سامنے آئی۔ جن میں علومِ حیاتیات اور علومِ طبعی شامل ہیں۔ جیسے جیسے سائنسی علوم میں وسعت پیدا ہوتی گئی، اس کو مزید شاخوں میں تقسیم کر دیا گیا تا کہ مختلف اشیا اور مادوں کا مطالعہ کرنے میں آسانی ہو۔

سائنس کی مختلف شاخیں:

ا۔ حیاتیات: (Biology)

بیالوجی دو الفاظ "Bio" اور "logy" سے مل کر بنا ہے۔ بائیو سے مراد 'زندگی' اور لوجی 'علم' کو کہتے ہیں۔ بیالوجی یعنی حیاتیات میں جان دار اشیا کے بارے میں علم حاصل کیا جاتا ہے۔ اس میں جان داروں کی اشکال، حرکات، اعضا، طب اور علاج وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل کی جاتی ہیں۔ حیاتیات کو سمجھنے کے لیے اسے مختلف شاخوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن میں چند ایک کے نام ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں:

ا۔ حیوانیات (Zoology)

۲۔ نباتات (Botony)

۳۔ خرد حیاتیات (Micro-Biology)

حیوانیات میں جانوروں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جن میں ان کی ساخت اور مختلف اعضا کی کارکردگی کا علم حاصل کیا جاتا ہے۔ نباتات میں پودوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس میں پودوں کی ساخت، ان کے مختلف حصوں کی نشو و نما اور افعال کے بارے میں علم حاصل کیا جاتا ہے۔ خرد حیاتیات میں خرد بینی جان داروں بیکٹیریا اور وائرس وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا میں بیالوجی کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

> سائنس کی اس شاخ میں جان داروں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ جانداروں کے خصائص، ان کی جماعت بندی، ان کی انواع کا ظہور اور ان کے باہمی اور اپنے ماحول کے ساتھ تعلق کا مطالعہ سب حیاتیات میں آتا ہے۔ حیاتیات ایسے کئی علمی میدانوں پر محیط ہے جنھیں بجائے خود الگ مضمون سمجھا جاتا ہے۔ حیات کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ حیاتیاتی طبیعیات (Biophysics)، حیاتیاتی کیمیا (Bio Chemistry) اور ماحولیات (Ecology) جیسی شاخوں میں کیا جاتا ہے۔ (۳۲)

۲۔ طبیعیات: (Physics)

طبیعیات سائنس کی وہ شاخ ہے جس میں مادہ، توانائی، خلا اور وقت کے اصولوں کا علم حاصل کیا جاتا ہے۔ اس میں کائنات کے نظم وضبط کو قائم رکھنے کے والے قوانین کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اس سائنسی علم میں مادے اور توانائی کے باہمی تعلق کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ آزاد دائرۃ المعارف میں اس کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے:

طبیعیات دراصل کائنات کی تشکیل کرنے والے بنیادی اجزا اور ان اجزا کے باہمی روابط کے مطالعے اور پھر ان کے زیر اثر چلنے والے دیگر نظاموں کے تجزیات کا نام ہے۔[۳۴]

طبیعیات یا فزکس کی بے شمار ذیلی شاخیں ہیں، جن میں چند ایک کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:

۱۔ میکانیات (Mechanics)

۲۔ ایٹمی طبیعیات (Atomic-Physics)

۳۔ نیوکلیائی طبیعیات (Nuclear-Physics)

۴۔ خلائی طبیعیات (Space-Physics)

۵۔ کیمیائی طبیعیات (Chemical Physics)

۶۔ فلکی طبیعیات (Astro-Physics)

اردو انسائیکلو پیڈیا میں سائنس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

سائنس کی وہ شاخ جس میں مادے، توانائی اور ان کے باہمی تعلق کا مطالعہ کیا جاتا ہے، طبیعیات کہلاتی ہے۔ اسے انیسویں، صدی کے اواخر میں فکری فلسفہ کہا جاتا ہے۔ بعض حوالوں سے طبیعیات قدیم ترین اور بنیادی خالص سائنس ہے۔ دیگر فطری علوم میں ان کی دریافتوں کا علمی اور عملی اطلاق کیا جاتا ہے۔ دیگر سائنسی علوم بالعموم محدود ہیں اور انھیں طبیعیات کی شاخیں قرار دیا جاتا ہے۔[۳۵]

۳۔ کیمیا: (Chemistry)

سائنس کی اس شاخ میں چیزوں کے بننے اور ٹوٹنے کے عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ علم کیمیا میں مرکبات اور عناصر کی ترکیب اور آپس میں تعامل کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ "آزاد دائرۃ المعارف" میں کیمیا کی تعریف کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے:

کیمیا سائنس کی وہ شاخ ہے جو مادے کی ترکیب (Composition)، ساخت، خواص اور مادوں کے تعاملات (Reactions) سے متعلق ہے۔ اس شعبہ علم میں خاص طور جوہروں کے مجموعات؛ مثلاً سالمات اور ان کے تعاملات، قلموں (Crystals) دھاتوں سے بحث کی جاتی ہے۔[۳۶]

کیمیا یا کیمسٹری کی درج ذیل شاخیں ہیں:

۱۔ نامیاتی کیمیا (Organic Chemistry)

۲۔ غیر نامیاتی کیمیا (In-Organic Chemistry)

۳۔ طبیعی کیمیا (Physical Chemistry)

۴۔ حیاتیاتی کیمیا (Bio-Chemistry)

۵۔ نیوکلیائی کیمیا (Nuclear Chemistry)

۶۔ صنعتی کیمیا (Industrial Chemistry)

۷۔ ماحولیاتی کیمیا (Envirmental Chemistry)

سید قاسم محمود اپنی کتاب اسلامی سائنس میں کیمیا کی تعریف کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

جدید علم کیمیا میں قدرتی طور پر پائے جانے والی اشیا کی تحلیل ماہیت سے وہ عناصر معلوم ہو جاتے ہیں۔ جو ان میں شامل ہیں اور تحلیل کمیت سے ان عناصر کا تناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان عناصر سے خود وہ اشیا اور بے شمار دوسری اشیا عمل تالیف سے بنائی جاسکتی ہیں۔ یہ ایسے نظری امور پر غور کا نتیجہ ہے جو مشاہدات پر بنتی ہیں۔ (۳۷)

۴۔ ریاضی: (Mathematics)

ریاضی کا لفظ 'ریاضت' سے نکلا ہے، جس کے معنی سیکھنا یا مشق کرنا ہے۔ ریاضی کا تعلق قدیم علوم سے ہے۔ قدیم تہذیبوں میں اس علم کے آثار ملتے ہیں۔ ریاضی میں اشیا کو گننا، شمار کرنا، پیمائش کرنا شامل ہے۔ "آزاد دائرۃ المعارف" میں اس کی تعریف ملاحظہ کریں:

ریاضی دراصل اعداد کے استعمال کے ذریعے مقداروں کے خواص اور ان کے درمیان تعلقات کی تحقیق اور مطالعہ کو کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ساختوں، اشکال اور تبدلات سے متعلق بحث بھی کی جاتی ہے۔ (۳۸)

ریاضی کی مختلف اقسام ہیں:

۱۔ ارتھ ریاضی (Earth-Mathematics)

۲۔ پیور ریاضی (Pure Mathematics)

۳۔ اطلاقی ریاضی (Applied Mathematics)

۴۔ الجبرا (Algebra)

۵۔ علم الہندسہ (Geology)

اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا میں علم ریاضی کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

اعداد، جیومیٹری اور مختلف مجرد تشکیلات یا تعمیرات کا استخراجی مطالعہ ریاضی کہلاتا ہے۔ خالص اور اطلاقی سائنس میں مختلف تفہیمات کے لیے مجرد تشکیلات و تعمیرات ریاضیاتی ماڈلوں کی، صورت میں سامنے آتی ہیں۔ علاوہ ازیں خالص ریاضیاتی یا منطقی غور و فکر بھیا نھیں جنم دیتا ہے۔ ریاضی کو زیادہ تر الجبرا، تجزیہ، جیومیٹری، اطلاقی سائنس اور فاؤنڈیشن جیسی شاخوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نظری کمپیوٹر اچھی جدید اطلاقی ریاضی میں شامل ہے۔[۳۹]

۵۔ ارضیات: (Geology)

ارضیات یا زمینیات زمین کے بارے میں علم کو کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے Geology کہا جاتا ہے۔ یہ سائنس کی وہ شاخ ہے جس میں کرہ ارض پر موجود اور زیر زمین پائی جانے والی اشیا اور معدنیات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ارضیات کو دوسرے سیاروں کے ٹھوس خواص اور قدرتی ساخت کے مطالعے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ 'آزاد دائرۃ المعارف' میں ارضیات کے بارے میں یہ تعریف رقم ہے:

ارضیات ہمیں زمین کی تاریخ کے بارے میں بھی بتاتی ہے اور اس کے لیے پلیٹ ٹیکٹونکس، زندگی کی ارتقائی تاریخ اور ماضی کے موسموں کے بنیادی ثبوت مہیا کیے جاتے ہیں۔ معدنیات اور خام تیل کی تلاش و اخراج، پانی کے ذخائر کا تخمینہ، قدرتی آفات کے سمجھنے، ماحولیاتی مسائل کے حل اور ماضی کے موسموں کو سمجھنے میں ارضیات کا اہم کردار ہے۔[۴۰]

ارضیات کی چند شاخوں کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے:

۱۔ ساختی ارضیات (Structural Geology)

۲۔ تاریخی ارضیات (Historical Geology)

۳۔ حرکیاتی ارضیات (Dynamic Geology)

۴۔ حجریات (Lithology)

۵۔ علم معدنیات (Mineralogy)

اسلامی سائنس میں سید محمود قاسم نے ارضیات کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے:

مسلمانوں نے طبقات الارض کا مطالعہ کر کے جو تصانیف پیش کیں، ان میں البیرونی کی تالیفات کو، صحت و باریک بینی کے لحاظ سے ممتاز درجہ حاصل ہے۔ اس نے مغربی ایشیا میں سفر کر کے زمین کی شکلوں اور پہاڑوں کی ساختوں کا

خوب مشاہدہ کیا۔۔۔معدنیات کی طبیعیاتی، کیمیائی اور مخفی ترکیبوں کا بھی بہت انہماک کے ساتھ مطالعہ کیا جاتا تھا۔ جواہرات پر بھی دفتر لکھے گئے جن میں بیش بہا پتھروں کے خواص، صفات اور قیمتوں کے علاوہ طبی اور مخفی تاثیروں کا بیان ہوتا تھا۔[۴۱]

۶۔ فلکیات: (Astronomy)

فلکیات سائنس کی وہ شاخ ہے جس میں اجرامِ فلکی، چاند، ستاروں، سیاروں اور کہکشاؤں کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ فلکیات کو ستاروں کا قانون بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں خلا میں موجود تمام اشیا کا سائنسی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اردو سائنس انسائیکلوپیڈیا میں فلکیات کی تعریف اس انداز میں بیان کیا گیا ہے:

> انگریزی اصطلاح اسٹرونومی کا لفظی مطلب ستاروں کے قوانین ہیں۔ اس میں فلکی اجسام (مثلاً ستارے، سیارے، شہابیے، دم دار تارے اور کہکشائیں وغیرہ) اور زمین کی فضا سے باہر وقوع پذیر ہونے والے مظاہر (مثلاً کونیاتی پس منظری شاعیں) کا مطالعہ شامل ہے۔ اس علم کے ماہرین ہیت دان فلکیات دان کہلاتے ہیں۔ ہیت دان آسمان کا مطالعہ دوربینوں، راڈاروں، طیف بینوں، کیمروں، مصنوعی سیاروں اور خلائی جہازوں کے ذریعے کراتا ہے۔ اس علم کا تعلق فلکی اجسام کے ارتقاان کی طبیعیات کیمیا اور حرکت سے ہے۔[۴۲]

علمِ فلکیات کا آغاز قدیم یونان میں ہوا تھا۔ فیثا غورث نے زمین کو کائنات کا مرکز قرار دیتے ہوئے کہا تھا۔ سورج، چاند، سیارے زمین کے گرد گردش کرتے ہیں اور زمین خود ساکن ہے۔ فلکیات کی اہم شاخیں درج ذیل ہیں:

۱۔ آپٹیکل فلکیات (Optical Astronomy)

۲۔ غیر آپٹیکل فلکیات (Non-Optical Astronomy)

۷۔ نفسیات: (Psychology)

نفسیات دراصل نفس کے مطالعہ کا نام ہے۔ یہ ایک ایسی سائنس ہے، جس کے ذریعے انسان کی ذہنی و دماغی کیفیات اور اس کی زندگی کے بارے میں بحث کی جاتی ہے۔ لفظ سائیکالوجی کا سب سے پہلے انگریزی زبان میں استعمال، انگریز سائنس دان ولیم ہاروے نے کیا۔ نفسیات پر ابتدائی تحریر ارسطو کی کتاب "De Anima" کو خیال کیا جاتا ہے۔ آزاد دائرۃ المعارف کے مطابق:

> نفسیات ایک وسیع علم ہے جو، صرف انفرادی علاج و معالجے تک محدود نہیں بلکہ اس میں جان داروں کی عقل (Mind) پر تحقیق اور اس کے انسانی و حیوانی رویے (Behaviour) پر اثرات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔[۴۳]

نفسیات کی چند شاخوں کا ذخر ذیل میں کیا جارہا ہے:

۱۔ تعلیمی نفسیات (Educational Psychology)

۲۔ تقابلی نفسیات (Comparative Psychology)

۳۔ طبی نفسیات (Clinical Psychology)

۴۔ صنعتی نفسیات (Industrial Psychology)

۵۔ سماجی نفسیات (Social Psychology)

۶۔ حیوانی نفسیات (Animal Psychology)

اردو سائنس انسائیکلوپیڈیا میں نفسیات کے بارے میں یوں درج ہے:

> اپنے ماحول کے ساتھ تعاملات کے دوران انسانوں کے رویے اور طرزِ فکر کا مطالعہ نفسیات کہلاتا ہے۔ یہ اصطلاح دو یونانی الفاظ 'سائیکی اور لوگوس' سے مل کر بنی ہے۔ جنھیں بالترتیب نفس اور علم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ماہرین نفسیات حسی ادراک، طرزِ فکر، آموزش جذبات، محرکات، شخصیت اور غیر معمولی رویے افراد کے باہمی تعاملات جیسے عملوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔[44]

عصر حاضر میں سائنس نے زندگی کے تمام شعبوں کو اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ ادب اس سے ماورا نہیں ہے۔ دنیا کے ہر ادب میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سائنس کی شمولیت ہوتی گئی۔ عصری تقاضوں کے تحت سائنسی رجحانات اور تصورات ادب کا حصہ بنتے چلے گئے۔ دورِ جدید میں ادب اور سائنس کو موضوع بنائے بغیر سائنسی فکر کی ترویج ممکن نہیں۔ عمران اختر اپنے مضمون "سائنس اور ادب" میں رقم طراز ہیں:

> ادب اور سائنس ہماری فکری کینوس پر ایک مکمل تصویر ایک مکمل سچائی کے ساتھ پیش کرنے کا نام ہے۔ جیسے جیسے جدید علوم کی جانب ارتقا کا عمل (ILLUSION) وقوع پذیر ہو رہا ہے، ویسے ادب اور سائنس اپنے اپنے فکری میلانات میں وسعت پیدا کرتے چلے جارہے ہیں۔[۴۵]

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> ادب اور سائنس تاریخی و تہذیبی تناظرات اور روابط و اشتراکات کا ایک ایسا حسین امتزاج ہمارے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں، جہاں جسم اور روح باہم مربوط و منظم دکھائی دیتے ہیں۔[۴۶]

اصنافِ ادب میں شاعری کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ شاعری اپنی اثر پذیری کی، صلاحیت کی بنا پر ہر عہد میں نمایاں رہی ہے۔ شاعری اور سائنس دونوں کے لغوی معنی "جاننے اور علم" کے ہیں۔ شاعری اور سائنس کا اصل ماخذ

انسانی شعور ہے۔ شعور ہی وہ طاقت ہے جو دونوں علوم کو باہم ہم آمیز کیے ہوئے ہے۔ اس لیے شاعری اور سائنس کو بہنیں کہا جاتا ہے۔ قدیم یونانی دور میں شاعری فلسفہ اور سائنس کی زبان کہلاتی تھی اور انسانی فلاح کے کاموں میں اس سے مدد لی جاتی تھی۔ بعد میں آنے والے شاعروں نے مبالغہ آرائی اور حسن و عشق کے مضامین کو شاعری کا حصہ بنایا اور اسے عظیم مقصد سے دور کر دیا لیکن جدید دور کے تقاضوں کے تحت شعری افکار میں تبدیلی آتی گئی اور شعر و ادب کے مقام و مرتبہ اضافہ ہونے لگا۔سائنس اور شعری جمالیات میں درج ہے کہ

> سائنس دان اور شاعر کو ایک دوسرے سے بے گانہ نہیں رہنا چاہیے۔ سائنس کی فتوحات شاعر کو زیادہ بہتر تحریک فراہم کر سکتی ہیں۔ (۴۷)

شاعر و ادیب اپنے معاشرے کے نبض شناس ہوتے ہیں۔ وہ معاشرتی رویوں کی نقش نگاری ایک ماہر کاریگر کی طرح کرتے ہیں۔ ایک تخلیق کار کا تعلق جس سرزمین سے ہو گا وہ اسی مٹی کی مہک احساسات و جذبات میں سمو کر ادب کی، صورت میں پیش کرے گا۔ جدید عہد میں سائنسی انکشافات نے انسانی فکر کو ہر سطح سے متاثر کیا ہے۔ عالمی ادب سے کلاسیکی ادب تک سائنسی تصورات شعر و ادب میں شامل ہوتے گئے۔ سائنسی ایجادات نے شاعروں کو جدید طرزِ بیاں اور منفرد لب ولہجہ عطا کیا۔ جمال نقوی ادب، سائنس اور جمہوریت میں لکھتے ہیں:

> نشاۃ ثانیہ کے ادیبوں میں دانتے اور ملٹن خاص طور پر فلکیات سے متاثر ہوئے تھے اور انھوں نے اس کا تذکرہ اتنے لطیف پیرائے میں کیا ہے۔ جب ملٹن گلیلیو کے نئے بصری آلات کا گرویدہ ہوا اور جب وہ اپنی نظم شیطان حضرت عیسیٰ کو اس دنیا کی سلطنت کا نظارہ پرانے انداز میں محض سادہ آنکھ کے ذریعے نہیں کرتا بلکہ ہوا یا دوربین کے شیشے کی بدولت اضافی شدہ نظارے کی بصری مہارت کے ذریعہ سے کراتا ہے۔ (۴۸)

انگریزی ادب میں شاعروں اور ادیبوں نے سائنسی فکر کو دانتے، ملٹن، الیگزینڈر پوپ، ورڈزورتھ، کولرج اور رابرٹ فراست نے شاعری میں سائنسی رجحانات کو فراغ دیا اور اپنی تحریروں میں اسے بہت خوبصورتی سے برتا۔ ولیم ورڈزورتھ نے اپنی کتاب "Lyrical Ballads" میں عصرِ حاضر کی شاعری کے بارے میں پیش گوئی کی تھی کہ:

> مستقبل میں کیمیادانوں، نباتات دانوں اور معدنیات دانوں کی دریافتیں شاعر کے فن کا موضوع ہوں گی۔ (۴۹)

اردو شاعری اور فکشن میں سائنسی ایجادات اور نظریات کا اظہار ملتا ہے۔ یہ سلسلہ دورِ قدیم سے جاری ہے۔ داستانوی ادب ہو یا شاعری دونوں میں سائنسی پہلوؤں کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں سائنسی تصورات کو استعمال تو کیا گیا ہے لیکن اس کی روایت خاصی کم زور رہی ہے۔ اگرچہ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ بہت قدیم ہے لیکن یہاں سائنس کی

ترویج کے لیے کوششیں بہت محدود نظر آتی ہیں۔ سماجی اور معاشرتی علوم کی طرف توجہ تو کی گئی لیکن سائنسی علوم کے فروغ کا رجحان بہت کم رہا۔ ڈاکٹر محمد شکیل خان کی تحقیق کے مطابق اردو شاعری میں سائنس کی اوّلین کتاب بھی دکن ہی سے معرضِ تحریر میں آئی۔

> سولہویں، صدی میں سائنس میں سب سے پہلی کتاب شہاب الدین قریشی بے دری نے 'بھوگ بھل' کے نام سے لکھی۔ اس طویل مثنوی کا ایک حصہ طب پر مشتمل ہے۔ اس مثنوی کا ایک مخطوطہ سالارِ جنگ میوزیم میں محفوظ ہے اور اسی مخطوطے کی دو نقلیں امپریل لائبریری کلکتہ میں بھی موجود ہیں۔ سوردوس کی تصنیف بھگوت گیتا (۱۵۹۱ء) موسیقی کی کتابوں میں قدیم ترین ہے۔ اس کے علاوہ مفرح القلوب (۱۷۸۳ء) اور معالجات کا خواجہ بندہ نواز (۱۲۸۱ء) جیسے مخطوطے دریافت ہو چکے ہیں۔ جن سے اردو میں سائنسی ادب کے تاریخی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔[۵۰]

ولی دکنی کے ہاں بھی فلکیات اور علمِ نجوم کے حوالے سے سائنسی تصورات ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ولی دکنی کی شاعری میں تاریخی، لسانی، فنی اور جمالیاتی عناصر بھی جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ کلاسیکی شعرا میں میر تقی میرؔ کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ میرؔ کی شاعری میں بھی فلکیات، طب اور دیگر سماجی علوم کا اظہار ملتا ہے۔ ڈاکٹر سید اسلم میر تقی میرؔ کے بارے میں اپنی کتاب قلب میں لکھتے ہیں:

> یہ بات آج دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ تقریباً اڑھائی سو سال قبل اردو کے مایہ ناز شاعر اور استاد میر تقی میرؔ نے حملہ قلب کی ہو بہو تصویر کھینچی تھی۔ اپنی آپ بیتی 'ذکرِ میر' میں انھوں نے اپنے منہ بولے چچا، استاد اور اتالیق سید امان اللہ کی علالت کا ذکر کیا ہے۔ طبی اعتبار سے تحریر اس دور کی جس طرح سے عکاسی کرتی ہے وہ ناقابلِ حد تک حملہ قلب کا، صحیح بیان ہے اور شاعرانہ مبالغہ سے پاک ہے۔ ماضی بعید میں اس روداد کو لکھنے کے لیے جس قوتِ مشاہدہ اور قدرتِ بیاں کی ضرورت تھی، وہ، صرف میرؔ جیسے عبقری کے بس کی بات تھی۔ ورنہ ہمارے ادب میں دردِ دل کا شاعرانہ ذکر تو بہت ہے لیکن، صحیح احوال مفقود ہے۔[۵۱]

میرؔ کے سائنسی تصورات کے بارے میں شمس الرحمان فاروقی اپنی تصنیف شعر شور انگیز میں میرؔ کے اشعار کی وضاحت کچھ یوں کرتے ہیں:

> میر نے سائنسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بادل میں جو پانی ہے وہ دراصل سمندر کا پانی ہے جو سورج کی تپش کے باعث بخارات میں تبدیل ہو کر بادل کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔[۵۲]

اسی طرح مصحفیؔ، غالبؔ، آتشؔ اور ناسخؔ کے ہاں بھی سائنسی اصطلاحات پائی جاتی ہیں۔ منشاری علم طب کی ایک مشہور اصطلاح ہے، مصحفی نے اس کا استعمال بڑے ماہرانہ طریقے سے کیا ہے۔

زیر آرہا نھیں رکھتی ہے شب ہجراں میں
دردمندوں کو نرے نبض جو منشاری[۵۲]

انیسویں، صدی میں یورپ سائنسی ترقی کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ اس کے اثرات پوری دنیا میں پھیل رہے تھے۔ ہندوستان بھی ان سائنسی علوم کی روشنی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ غالبؔ بھی اسی عہد سے تعلق رکھتے تھے۔ اس دور میں دلی کے مدارس میں علم طبیعیات، ریاضیات، فلکیات جیسے علوم پڑھائے جاتے تھے۔ غالبؔ کے عہد میں یورپ کی سائنسی ترقی کے اثرات کے حوالے سے ڈاکٹر محمد حسن رقم طراز ہیں:

> غالبؔ کے دور تک آتے آتے ایک طرف تو یورپ عہدِ ظلمت سے نکل کر روشن خیالی کے دور میں داخل ہو چکا تھا تو دوسری طرف ایشیا سے اس کے تجارتی تعلق کی اجارہ داری ہندوستان ہی نہیں، ترک، ایرانیوں کے ہاتھ سے بھی نکل چکی تھی۔ جو ہند ایرانی تہذیب کی بنیاد تھی۔ اب ان اہلِ حرفہ کی اہمیت نہ تھی جو ڈھاکے کی ململ بنتے اور بیرونِ ملک برامد کرتے تھے۔ اب انسان اپنے ہاتھ میں عقل اور ارتقا کے نئے ہتھیار کے ذریعے لامحدود اختیارات کو ختم کرنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔[۵۴]

غالبؔ کے سائنسی شعور کے حوالے سے ذیل میں ان کے اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:

کچھ نہ کچھ اپنے جنونِ نا رسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ رو کشِ خورشید عالم تاب تھا[۵۵]

غالبؔ طبعی اور کیمیائی تبدیلی کو کس خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں:

ضعف سے گریہ مبدل بدم سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا[۵۶]

غالبؔ کے بعد اقبالؔ کی شاعری میں بھی ہمیں جابجا سائنسی رجحانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اقبالؔ نہ، صرف شاعر بلکہ فلسفی اور مفکر بھی تھے۔ ان کی شاعری میں ہمیں سائنس کے جدید انکشافات اور نظریات واضح نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ کے سائنسی شعور کے حوالے سے ذیل میں چند اشعار پیش کیے جا رہے ہیں:

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں، لا الہ الا اللہ[۵۷]

نظریہ اضافیت کو اقبالؔ نے نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ہے:

احوال و مقامات پہ موقوف ہے سب کچھ

ہر لحظہ ہے سالک کا زمان و مکاں اور[۵۸]

اپنے خطبات میں نظریہ اضافت پر بحث کرتے ہوئے اقبال رقم طراز ہیں:

> اس نظریے کی رو سے فضا مادے پر منحصر ہے۔ آئن سٹائن کے موجب کائنات کسی لامحدود خلا میں ایک جزیرہ نہیں بلکہ وہ متناہی لیکن غیر محدود ہے جس کے آگے کوئی فضا نہیں۔[۵۹]

بیسویں، صدی اردو نظم و نثر میں موضوعاتی تبدیلیوں کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس، صدی میں سائنسی ترقی، نئی ایجادات اور جدید سائنسی آلات نے تہذیب و ثقافت کو متاثر کیا اور فکری سطح پہ نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں، جس کے گہرے اثرات ادب پر نظر آتے ہیں۔ اس عہد کی شاعری میں ارضیات، فلکیات، طبیعیات، حیاتیات، نباتات اور کیمیا کی سائنسی اصطلاحات بارہا دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اردو نظم میں ایسے اشعار ہزاروں کی تعداد میں ہیں جو کسی نہ کسی سائنسی نقطے کی وضاحت کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ عبداللہ سکھیرا اپنے مضمون "احمد ندیم قاسمی کی نظم میں سائنسی شعور" اردو نظم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> اردو نظم میں سائنسی حوالے سے کسی سائنسی دریافت، سائنسی نظریے یا ایجاد کے وجود میں آنے کے بعد ان سے متاثر ہو کر شعری تجربے کا حصہ بنائے گئے ہیں۔ بعض جگہ سائنسی حوالے کسی نظریے، ایجاد یا دریافت کے وجد میں آنے سے قبل ہی خالصتاً شاعر کے زورِ تخیل کی کرشمہ کاری کے تحت موضوعِ شعر بنے۔[۶۰]

دورِ جدید میں سائنسی شعور کے حوالے سے اردو نظم میں ن-م راشد، نذیر احمد شیخ، مجید امجد، احمد ندیم قاسمی اور شہزاد احمد کے ہاں سائنسی تصورات کی حامل شاعری ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ریاض مجید، صابر ظفر، امین خیال، ڈاکٹر حامد سلیم، جواز جعفری، غلام حسین ساجد، حسین حمدانی اور کاشف نعمانی قابلِ ذکر ہیں۔

اردو شاعری کی تاریخ صدیوں پُرانی ہے۔ امیر خسرو کی پہیلیوں سے لے کر نظم کی جدید اصناف تک شاعری نے بے شمار روپ بدلے۔ وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی حالات سے ہیتی اور موضوعاتی سطح پر تبدیلیاں رونما ہوئیں، جس سے اردو شاعری میں نئے مباحث نے جنم لیا۔ شعرا کا رجحان بدلا اور انھوں نے روایتی موضوعات سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے جدید فکر اور اسلوب کو اپنایا۔ عقلیت پسندانہ رویے کی بدولت سائنسی افکار شاعری کا حصہ بن گئے اور سائنسی ایجادات اور نظریات نے انسانی فکر کو ہر سطح پر متاثر کیا۔

معاشرتی سانچے کی تشکیل میں شاعر و ادیب ایک معمار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ معاشرتی رویوں کی نقش نگاری ایک ماہر کاریگر کی طرح کرتے ہیں۔ ایک تخلیق کار سماج کا بہترین نبض شناس ہوتا ہے اور اپنے عہد کے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، سماجی اور سائنسی افکار میں ہونے والی تبدیلیوں کو آفاقی سطح پر پیش کرنے کی، صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے سائنسی عہد میں ادبا اور شعرا کا سائنسی فکر سے قطع تعلق اختیار کرنا ممکن نہیں رہا۔

سائنس اور شاعری کا تعلق بیسویں صدی میں نمایاں طور پر سامنے آیا۔ سائنسی ترقی جدید ذہنوں اور نت نئے افکار کی مرہونِ منت ہے۔ ادب اور سائنس کے باہمی رشتے کا فہم حاصل کرنا انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک نے سائنس اور شاعری کے بنیادی تعلق کو سمجھتے ہوئے سائنس کی تدریس کے لیے شاعری کو موثر ذریعہ قرار دیا ہے۔ جدید عہد میں پروان چڑھنے والی زندگی کو سائنس و ٹیکنالوجی نے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ لہٰذا جدید نسل کے لیے مبالغہ آرائی پر مبنی شاعری کو قبول کرنا ممکن نہیں رہا۔ ان کے لیے ایسے تصورات اور نظریات پر یقین کرنا مشکل ہو گیا ہے، جو غیر منطقی اور غیر سائنسی ہوں۔

حوالہ جات

۱۔ مجنوں گورکھ پوری، ادب اور زندگی (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۵۷۔

۲۔ ایضاً، ص ۶۳۔

۳۔ ایضاً، ص ۴۲۔

۴۔ غلام عباس، جدید اردو نظم میں تصور کائنات (مقالہ برائے پی ایچ ڈی، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء)، ص ۷۔

۵۔ شکیل الرحمان، اساطیر کی جمالیات (مدھوبن بہریانہ ۲۰۰۹ء)، ص ۱۶، ۱۵۔

۶۔ غلام عباس، جدید اردو نظم میں تصور کائنات (مقالہ برائے پی ایچ ڈی، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء)، ص ۴۔

۷۔ سائنس اور ادب، www.sangatacademy.net/cms, ۴:۱۵، ۱۶ فروری ۲۰۲۱۔

۸۔ ادب، Ur.m.wikipedia.org، ۴:۵۰، ۲۰ جنوری ۲۰۲۱ء۔

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ اختر حسین رائے پوری، "ادب اور زندگی" مشمولہ ترقی پسند ادب، مرتبہ پروفیسر قمر رئیس، سید عاشور کاظمی (لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء)، ص ۱۶۱، ۱۶۰۔

۱۱۔ احمد سجاد، تعمیری ادبی تحریک: افکار و مسائل (نئی دہلی: قاضی پبلشرز، ۱۹۹۴ء)، ص ۲۲۔

۱۲۔ طارق سعید، اردو ادب کا تہذیبی پس منظر (لاہور: طیب شمشاد پرنٹرز، ۲۰۱۵ء)، ص ۵۔

۱۳۔ عبدالباری، لکھنو کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس)، ص ۱۸۔

۱۴۔ نجیب جمال، ترقی پسند تحریک: تخلیقی ادب میں نظریے کی فعالیت اور سماجی شعور کی اہمیت، مشمولہ اردو ادب کی ترقی پسند تحریک مرتبہ احمد پراچہ (لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۰ء)، ص ۱۵۔

۱۵۔ مجنوں گورکھ پوری، ادب اور زندگی (کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۸ء)، ص ۴۰۔

۱۶۔ جمال نقوی، ادب، سائنس اور جمہوریت (کراچی: احمد برادرز، ۲۰۰۷ء)، ص ۳۴۷۔

۱۷۔ صلاح الدین درویش، انسان، کائنات اور سماج (لاہور: بیکن ہاؤس، ۲۰۱۱ء)، ص ۶۹۔

۱۸۔ عبید اللہ سکھیرا، "احمد ندیم قاسمی کی نظم میں سائنسی شعور" مشمولہ نقاط، ش ۱۰ (اکتوبر ۲۰۱۱ء)، ص ۳۳۹۔

۱۹۔ سید عبداللہ، اشارات تنقید (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء) ص ۶۰۔

۲۰۔ ابوالفضل، مترجم، المنجد (لاہور: عبداللہ اکیڈمی)، ص ۲۷۔

۲۱۔ سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ (نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء)، ص ۱۵۔

۲۲۔ نثار اکبر آبادی، شعر اور فن شعر (لاہور: جاسم پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۵۔

۲۳۔ ہادی حسین، شاعری اور تخیل (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۵ء)، ص ۱۔

۲۴۔ وزیر آغا، اردو شاعری کا مزاج (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۵۔

۲۵۔ کوثر مظہری، جدید نظم: حالی سے میرا جی تک (نئی دہلی: مطہر پبلی کیشن، ۲۰۰۸ء)، ص ۶۰۔

۲۶۔ غلام عباس، جدید اردو نظم میں تصورِ کائنات (مقالہ برائے پی ایچ ڈی، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۶ء)، ص ۵۔

۲۷۔ سعید احمد، اردو شاعری کا سائنسی شعور (مقالہ برائے پی ایچ ڈی، محزونہ گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء)، ص ۳۔

۲۸۔ ہادی حسین، مغربی شعریات (لاہور: مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء)، ص ۲۷۔

۲۹۔ جمال نقوی، ادب سائنس اور جمہوریت، ص ۳۴۸۔

۳۰۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا، ص ۱۴۶۔

۳۱۔ سائنس، آزاد دائرۃ المعارف، ur.m.wikipedia.org، ۰۵:۰۶، ۳۰ جنوری ۲۰۲۱ء۔

۳۲۔ محمود علی سڈنی، فلسفہ سائنس اور کائنات (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۶، ۱۷۔

۳۳۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا (لاہور: اردو سائنس بورڈ، جلد ۲، طبع اول، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۳۶۔

۳۴۔ طبیعیات، آزاد دائرۃ المعارف، ur.m.wikipedia.org، ۳۲:۰۸، ۳۰ دسمبر ۲۰۲۰ء۔

۳۵۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا (لاہور: اردو سائنس بورڈ، جلد، طبع)، ص ۱۲۸۰۔

۳۶۔ کیمیا، آزاد دائرۃ المعارف، ur.m.wikipedia.org، ۰۴:۰۳، ۱۰ فروری ۲۰۲۱ء۔

۳۷۔ قاسم محمود، اسلامی سائنس (لاہور: الفیصل ناشران وتاجران کتب)، ص ۱۷۶۔

۳۸۔ ریاضی، آزاد دائرۃ المعارف، ur.m.wikipedia.org، ۱۵:۰۵، ۱۲ فروری ۲۰۲۱ء۔

۳۹۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا، جلد ۱۰، ص ۱۴۶۔

۴۰۔ ارضیات، آزاد دائرۃ المعارف، ur.m.wikipedia.org، ۲۰:۰۸، ۱۲ فروری ۲۰۲۱ء۔

۴۱۔ قاسم محمود، اسلامی سائنس، ص۱۰۱۔
۴۲۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا، جلد۲، طبع اول، ص۱۴۶۔
۴۳۔ نفسیات، آزاد دائرۃ المعارف، ur.m.wikipedia.org، ۱۶،۲۵:۰۳ فروری ۲۰۲۱ء۔
۴۴۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا، جلد۸، ص۱۵۴۳۔
۴۵۔ سائنس اور ادب، www.sangatacademy.net/cms، ۱۶،۱۵:۰۴ فروری ۲۰۲۱ء۔
۴۶۔ ایضاً۔
۴۷۔ عبید اللہ سکھیرا، "احمد ندیم قاسمی کی نظم میں سائنسی شعور"، مشمولہ نقاط، (ش۱۰، اکتوبر ۲۰۱۱ء)، ص۳۴۰۔
۴۸۔ جمال نقوی، ادب سائنس اور جمہوریت، ص۳۴۸۔
۴۹۔ عبید اللہ سکھیرا، "احمد ندیم قاسمی کی نظم میں سائنسی شعور، مشمولہ، نقاط، ص۳۳۹۔
۵۰۔ شکیل خان، اردو میں سائنسی و تکنیکی ادب (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۸ء)، ص۲۶۔
۵۱۔ سید اسلم، قلب (لاہور: منشورات)، ص۳۹۸۔
۵۲۔ شمس الرحمن فاروقی، شعر شور انگیز (دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں، جلد اوّل، ۱۹۹۷ء)، ص۲۵۷۔
۵۳۔ کلیات مصحفی مرتبہ، ڈاکٹر انوار الحسن نقوی (لاہور: مجلس ادب، ۱۹۹۴ء)، ص۲۵۳۔
۵۴۔ سائنس اور غالب www.urduweb.org، ۲۰:۴، ۷ مئی ۲۰۲۱ء۔
۵۵۔ خلیل الرحمن بینا، دیوان غالب، (لاہور: دارالشعور، ۲۰۱۵ء)، ص۶۶۔
۵۶۔ ایضاً، ص۱۴۲۔
۵۷۔ کلیات اقبال، نگران، انعام الحق جاوید (لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۱۵ء)، ص۵۶۷۔
58۔ ایضاً، ص۴۶۹۔
59۔ اقبال اور سائنس www.Daanish.pk ۳:۴۵، ۲۲ مارچ ۲۰۲۱ء۔
60۔ عبید اللہ سکھیرا، احمد ندیم قاسمی کی نظم میں سائنسی شعور، مشمولہ نقاط، (ش۱۰، اکتوبر ۲۰۱۱ء)، ص۳۴۱۔

باب دوم:

عزیز حامد مدنی بحیثیت نظم نگار

باب دوم:

عزیز حامد مدنی بحیثیت نظم نگار

تعارف:

عزیز حامد مدنی کا نام ترقی پسند تحریک کے نظم نگار اور غزل گو شاعر کی حیثیت سے معروف ہے۔ انھوں نے دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح روایت سے مکمل رشتہ نہیں توڑا لیکن جدت کی طرف ضرور مائل ہوئے۔ وہ اپنے معاصرین میں معتبر حوالہ بن کر ابھرے اور اپنی منفرد شاعری سے ایک الگ پہچان بنائی۔

عزیز حامد مدنی نے ۲۱ جون ۱۹۲۲ء[۱] کو رائے پور کے ایک علمی اور ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ ان کے والد گرامی محمد حامد ساقی علامہ شبلی نعمانی کے شاگرد اور مولانا محمد علی جوہر کے ہم جماعت تھے۔ رائے پور شروع سے ہی علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔ اختر حسین رائے پوری اور ادیب رائے پوری جیسی شخصیات کا تعلق بھی اسی شہر سے ہے۔ اب یہ علاقہ مدھیہ پردیش کہلاتا ہے۔ اختر حسین رائے پوری مدنی کے رشتے دار ہونے کے ساتھ ساتھ رفیق خاص بھی تھے۔ ان میں بڑی قرابت اور ہم آہنگی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد مدنی اپنے خاندان سمیت کراچی آ گئے۔ وہ ممبئی کے ساحلی علاقے سے پاکستان پہنچے۔ ان کا جہاز ۲۲ فروری ۱۹۴۸ء[۲] کو کراچی بندر گاہ پر لنگر انداز ہوا۔ کچھ عرصہ پرنس روڈ کے علاقے میں رہائش پذیر رہے۔ اس کے بعد اپنے خاندان سمیت پیر الٰہی کالونی منتقل ہو گئے اور تاحیات وہیں قیام پذیر رہے۔

عزیز حامد مدنی نے ناگپور یونی ورسٹی سے انگریزی میں ایم-اے کا امتحان پاس کیا۔ انھوں نے Screen Past جریدے سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ سول سروسز کا امتحان دیں لیکن انھوں نے انگریزی کے لیکچرر ہونے کو فوقیت دی۔ زیڈ۔ اے۔ بخاری کی ایما پر ریڈیو پاکستان میں ملازمت اختیار کی۔ مدنی ریڈیو پاکستان میں ۱۹۵۰ء کے فیڈرل پبلک سروس کے مقابلے میں پروگرام ایگزیکٹو کی آسامی کے لیے منتخب ہوئے۔ اس وقت ریڈیو پاکستان نیول کالونی کے پاس ایک سکول کے قریب چند خیموں میں قائم تھا۔ وہاں پہنچنے کے لیے مدنی کو طویل مسافت طے کرنا پڑتی تھی۔

ایم اے جناح روڈ پر واقع زیلن کافی ہاؤس میں مدنی کی شہر کے ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کے ساتھ خوب محفلیں جمتی تھیں۔ ساقی فاروقی نے ان محافل کی رونقوں کا ذکر اپنی تصنیف میں بہت جوش و جذبے سے کیا ہے۔ مدنی کی

بنیادی شناخت ان کی منفرد شاعری ہے، جو انھیں باقی شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ رائے پور کے آل انڈیا مشاعرے میں اپنی نظم "آج کی رات کے بعد" سنا کر انھوں نے بہت داد سمیٹی تھی۔ یہ وہی تاریخی مشاعرہ تھا جس میں ساحر لدھیانوی نے پہلی مرتبہ مشہور نظم "تاج محل" سنائی۔ اختر الایمان بھی اس مشاعرے میں شریک تھے۔ ان دونوں شعرا کے ساتھ مدنی کے ذاتی مراسم تھے۔

عزیز حامد مدنی کی شاعری کے نئے دور کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ ریڈیو پاکستان پشاور منتقل ہوئے۔ ان دنوں ریڈیو پاکستان ہی علم و ادب کا گہوارہ ہوا کرتا تھا۔ ن-م۔ راشد اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ مدنی نے نظم اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کی۔ نظم میں اپنی انفرادیت کے جوہر دکھائے اور غزل کے میدان میں بھی اوجِ کمال حاصل کیا۔ عزیز حامد مدنی کی غزل کے بارے میں نقاد شمیم احمد لکھتے ہیں:

> جب تک مدنی کی غزل گوئی کا ذکر نہ کیا جائے تب تک ان کی شاعری کا جائزہ نامکمل رہے گا۔ ان کی غزل نے اردو غزل کو سائنٹفک عہد تک پہنچایا۔ جہاں فطرت اور قدرت کا عمل، حسن کے قدرتی اور فطری عمل سے ہم آمیز ہو جاتا ہے۔[3]

یہ مقولہ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ مدنی کی غزل میں اعلیٰ درجے کی وجدانی کیفیات پائی جاتی ہیں جو قدرتی حسن اور فطری عمل کو اس سلیقے سے ملاتی ہیں کہ دیکھنے والی آنکھ حیرت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ یہی مدنی کے تغزل کا خاص اسلوب ہے۔ انجمن ترقیِ اردو کے زیر اہتمام مدنی کی کتاب جدید اردو شاعری (حصہ اوّل) کی مکرر اشاعت پر مرتب کی جانے والی تقریب اجرا کے موقع پر، صدر انجمن آفتاب احمد خان نے اپنی، صدارتی تقریر میں کہا کہ:

> عزیز حامد مدنی ایسے قد آور شاعر اور نقاد تھے جو اردو ادب کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ان کی بلند پایہ شاعری اور تنقیدی سرمایہ پر گفتگو ہوتی رہے گی۔[4]

مدنی نے شاعری کے علاوہ تنقید میں بھی اپنے عمیق مطالعہ، فلسفیانہ سوچ اور سائنسی تصورات کی بدولت ایک خاص مقام حاصل کیا ہے۔ افسوس کہ ان کی زندگی میں ان کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جس کے وہ حق دار تھے۔ دنیا بھر کی شاعری کا جیسا مطالعہ ان کا تھا، ویسا بہت کم لوگوں کا ہوتا ہے۔

پروفیسر رئیس علوی مدنی کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> وہ متنوع علمیت کے ادیب و شاعر تھے۔ انھوں نے ایک ایسے دور میں اپنا مقام بنایا جو کہ جوش، فیض اور ن۔ م۔ راشد سے موسوم تھا لیکن انھوں نے غالبؔ کا سا انداز اپنایا۔ وہ مکالمے کے آدمی تھے۔[5]

عزیز حامد مدنی نے شاعری کے ارتقائی سفر کو بہت تیزی سے پار کیا اور بہت جلد فکر اور اسلوب میں قدم جما کر کھڑے ہو گئے اور اپنے ہم عصر شعرا کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگے۔

کراچی یونی ورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور عزیز حامد مدنی کے بھتیجے ظفر سعید سیفی بتاتے ہیں کہ وہ ہر وقت مطالعے میں غرق رہتے تھے۔ ان کی لائبریری میں فرانسیسی، انگریزی، فارسی اور دیگر زبانوں کا بڑا ادب موجود تھا۔

مدنی وسیع المطالعہ دانش ور اور صاحب علم ادیب تھے۔ انگریزی کے طالب علم ہونے کی بدولت وہ ہمیشہ برناڈ شاہ، اڈن، شیکسپیئر اور دیگر ادیبوں اور شاعروں کے حوالے دیا کرتے تھے۔ ان کے پسندیدہ موضوعات میں جدید فرانسیسی شاعروں کا مطالعہ اور ان کے کلام کا تجزیہ بھی شامل تھا۔

مدنی کی مغربی ادب سے اس درجہ شناسائی اور رغبت رکھنے پر ساقی فاروقی رقم طراز ہیں:

> عزیز حامد مدنی برصغیر میں رہتے ہوئے مغرب کا دل رکھتے تھے۔ (۶)

پروفیسر ڈاکٹر شاداب احسانی نے مدنی کو ترقی پسند قرار دیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ اپنی ذات کو چھپاتے تھے لیکن گہرے مفاہیم کے حامل تھے۔ ان کی شاعری اور تنقید میں ہیت، اسلوب اور عصری کیفیات کے تینوں دائرے موجود ہیں۔ انھوں نے بڑے شہر کی زندگی میں سائنسی و معاشرتی اثرات کو خوبصورتی سے منعکس کیا۔

مدنی کی پوتی قرۃ العین اپنے دادا کی محبت و شفقت کے بارے میں لکھتی ہیں:

> وہ محض اپنی ذات میں محدود نہ تھے بلکہ اپنے گھرانے میں تمام افراد کا خیال رکھتے تھے۔ خصوصاً بچوں سے محبت کرتے تھے اور ان کی تربیت کے لیے بہت وقت دیتے تھے۔ (۷)

عزیز حامد مدنی تمام عمر اکیلے رہے اور رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ ہوئے۔ انھوں نے خود تو شادی نہ کی لیکن اپنے بڑے بھائی کے بچوں کو پالا۔ ان کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اپنے تمام وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کی کفالت اور تربیت میں بھرپور حصہ لیا۔ آپ کے بڑے بھائی جوانی میں ہی وفات پا گئے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بظاہر کم گو، بے نیاز اور مجذوبانہ سی شخصیت کے حامل عزیز حامد مدنی ایک حساس دل رکھنے والے انسان تھے اور اس کے ساتھ اپنی معاشرتی ذمہ داریوں سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔

اپنے بڑے بھائی کے انتقال پُر ملال پر انھوں نے ایک نظم بھی تحریر کی، جس کا عنوان تھا "بھائی کی وفات پر"۔

گھر میں کیا رہیے کہ ویرانی سی ویرانی ہے
صاحب خانہ کا سایہ تھا جہاں ، ساتھ نہیں

وہ قناعت کہ جو سیرابامارت تھی بہت
ریگِ صحرا میں وہی موجِ رواں ساتھ نہیں
وہ ذہانت جو امینِ سخن آبا تھی
جب ضرورت ہے مِری خود وہیہاں ساتھ نہیں
اب اندھیرا ہے بہت راہ میں،اے پائے جنوں!
روشنی دیتی ہوئی شمع نہاں ساتھ نہیں(۸)

احمد جاوید اپنے لیکچر میں مدنی کی شخصیت کے بارے میں کچھ اس طرح بتاتے ہیں کہ:

مدنی بہت باکمال شخصیت کے مالک تھے۔ ان میں وہ تمام اجزا موجود تھے جو کسی بھی بڑی شخصیت میں پائے جانے لازم ہوتے ہیں۔ ایسا کردار اگر کسی دینی یا مذہبی شخص میں آجائے تو وہ ولی اللہ ہے۔(۹)

عزیز حامد مدنی کا شمار بیسویں، صدی کے باشعور اور ذکی الحس شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف براڈکاسٹر اور سکالر تھے بلکہ ماہر لسانیات، نقاد، محقق، مترجم اور شاعر بھی تھے۔ عالمی ادب کے حوالے سے ان کا مطالعہ قابلِ رشک تھا۔

احمد جاوید مدنی کے بارے میں کہتے ہیں:

وہ نہ، صرف شاعر تھے بلکہ مکمل ادیب تھے۔ میں نے زندگی میں ایسا فنافی الادب آدمی نہیں دیکھا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا ادب تھا۔(۱۰)

عزیز حامد مدنی کے چار شعری مجموعے ہیں۔ جن کے نام درج ذیل ہیں:

۱۔ چشمِ نگراں (۱۹۶۲ء)
۲۔ دشتِ امکاں (۱۹۶۴ء)
۳۔ نخلِ گماں (۱۹۸۳ء)
۴۔ گلِ آدم (۲۰۱۳ء)

تنقیدی کتب میں جدید اردو شاعری کی دو جلدیں شامل ہیں اور اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب بعنوان فیض احمد فیض ایک مطالعہ:آج بازار میں پا بجولاں چلو، بھی ان کا تنقیدی کارنامہ

ہے۔انھوں نے جدید فرانسیسی نظموں کے تراجم بھی کیے۔ مدنی نے ۱۹۵۰ء میں شیکسپیر کے ڈرامے اوتھیلو کا ترجمہ کیا اردو میں شیکسپیر کا یہ پہلا ترجمہ ہے جو بلینک ورس میں کیا گیا۔

عزیز حامد مدنی بحیثیت رزیڈنٹ ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان کی ملازمت سے ریٹائرڈ ہوئے۔ اس کے بعد گلشنِ اقبال کراچی میں سکونت پذیر رہے اور تاحیات وہیں قیام کیا۔ انھیں گلے کا کینسر ہو گیا تھا۔ اسی بیماری کے باعث ۲۳ اپریل ۱۹۹۱ء کو کراچی میں انتقال کر گئے۔ آپ کا جسدِ خاکی لیاقت آباد کے قبرستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔

عزیز حامد مدنی کی نظم نگاری:

بیسویں صدی تغیرات کی، صدی کہلاتی ہے۔ اس، صدی میں ادبی، صورت کا ڈھانچہ از سر نو تشکیل پانے لگا تھا، جو کہ پہلی شکل و، صورت اور اظہار سے بالکل مختلف تھا۔ اس تبدیلی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو بہت سے ایسے حالات وواقعات نظر آتے ہیں جس نے ادبی دنیا کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر بھی اتنے گہرے اثرت مرتب کیے کہ پہلی تصویروں کے تمام رنگوں کو مٹا کر ان پر نئے سرے سے نقش و نگار کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ چاروں طرف سے انسانیت کو مشکلات و مصائب نے گھیرا ہوا تھا۔ سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور ذہنی تنزل انتہا کو چھو رہا تھا۔ ان کا انسانیت سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ عالمی جنگوں نے ایک ایسے انسان کو جنم دیا جو بے یقینی اور عدم تحفظ کا شکار تھا۔ بے چینی، بے اطمینانی اور اضطراب کے بادل منڈلا رہے تھے۔ بے یقینی کا یہ عالم تھا کہ انسان نے دنیاوی خداؤں سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور آسمان کی طرف نگاہیں جما کر دستِ سوال بلند کرنے لگا تھا۔ اعتقاد کی سرزمین پر ایک بھونچال سا آیا اور ظاہری آنکھ سے دِکھنے والے خداؤں کے تخت زمین بوس ہو گئے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد انسانیت حد درجہ زوال پذیر ہو گئی۔ اَن گنت انسانی جانوں کے زیاں، انسانی وقار کی پامالی، بے وقعتی، اخلاقی اقدار کی گراوٹ کے باعث سیاسی، اقتصادی، معاشی، معاشرتی بحران کا آغاز ہونے لگا، جس کے اثرات نے دنیائے ادب کو بھی پوری گہرائی سے متاثر کیا۔ رشید امجد اپنی تصنیف پاکستانی ادب، روّیے اور رجحان میں درج بالا، صورتِ حال کی وضاحت کچھ اس طرح کرتے ہیں:

> جنگِ عظیم دوم نے مغرب کے سارے نظام کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ ایشیا میں، صنعتی بیداری کے ساتھ ساتھ ایک نئی سیاسی لہر اٹھ رہی تھی جس میں وطنیت یا قوم پرستی کا عنصر ایک اہم موضوع تھا۔ ہمارے ادیب مغرب پر تنقید بھی کر رہے تھے اور مغربی شعر و ادب سے متاثر بھی ہو رہے تھے، چناں چہ جدید مغربی رویے، تحریکیں اور رجحانات تیزی سے ہمارے یہاں در آئے تھے۔[11]

بیسویں صدی میں اصنافِ ادب کی ساخت، ڈھانچے اور خط و خال میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ اردو نظم نگاری کی ہیت بدلی اور ایک نئی شکل وصورت نکھر کر سامنے آنے لگی۔ نظم نگاری کی روایت میں نئے رجحانات، میلانات اور فکری رویے اپنی جگہ بنانے لگے۔ مستقبل کی خواب آلودہ فکر نے ایک ذہنی انتشار کو جنم دیا جس کے باعث نوجوان شاعروں اور ادیبوں میں باغیانہ سوچ پیدا ہوئی۔

عالمی جنگوں نے جہاں دنیا کے تمام ممالک کو متاثر کیا وہاں ہندوستانی عوام مشکلات، جبر و استبداد اور ظلم و ستم کی چکی میں پسنے لگی۔ شاعروں اور ادیبوں کی نظریاتی سطحیں بلندی کی طرف مائل ہونے لگیں۔ روایتوں کے خلاف فکری سوچ پروان چڑھنے لگی۔ مغربی مفکرین کے نظریات تیزی سے شعر و ادب کی دنیا کا حصہ بننے لگے۔ اصلاحی، قومی، مقصدی اور حقائق پر مبنی موضوعات پر نظمیں لکھی جانے لگیں۔ محمد حسین آزاد نے نظم نگاری کو اوجِ کمال تک پہنچانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ انھوں نے مغربی، صنفِ ادب مشرق کی مٹی میں سینچ کر رنگ و خوشبو کے ایسے گل کھلائے جن کی مہک کئی صدیاں گزر جانے کے بعد بھی محسوس کی جاتی رہے گی۔ انھوں نے نظموں کے ذریعے عام آدمی سے مکالمہ کیا، موجودہ عہد کے مسائل اور حقیقی زندگی کے مد و جذر کو نظم کی صورت منظرِ عام پر لانے کے لیے محنت و استقامت سے قدم بڑھاتے رہے۔

جدید شعرا میں حالیؔ، شبلیؔ، جوشؔ، چکبستؔ، حفیظ جالندھریؔ، اکبر الٰہ آبادی اور اقبالؔ کے نام سرفہرست ہیں۔ ان شعرائے کرام نے نئے موضوعات پر اعلیٰ پائے کی نظمیں تحریر کیں۔ نظم نگاری کی جڑوں کو مضبوط کرنے میں درج بالا شخصیات کا مقابلِ رشک ہے۔ وقت کے ساتھ نظم اسلوبی، ہیتی سطح پر بلند ہونے لگی اور خوبصورت تشبیہات، استعارات، علامات اور لفظیات کے رنگ اپنا کر اپنے خط و خال سنوارنے لگی۔ رشید امجد لکھتے ہیں:

> پاکستانی ادب کے ان پچاس سالوں میں (۱۹۴۷ء-۱۹۹۷ء) میں نظم مختلف تکنیکی، اسلوبی اور موضوعاتی اتار چڑھاؤ سے گزرتی رہی، اس میں نئی راہوں کی تلاش کا جذبہ بھی تھا اور فیشن پرستی سے چمٹے رہنے کی ضد بھی اور روایت کو دانستہ نظر انداز کرنے کی کوشش بھی، لیکن رفتہ رفتہ ایک متوازن رویہ نظم کی پہچان بنتا چلا گیا۔ لسانی تشکیلات سے تکنیکی سانچوں کی توڑ پھوڑ تک نظم نے کئی چہرے بدلے، کبھی یہ چہرے اتنے دھندلے ہوئے کہ نظم کا وجود لرزتا ہوا محسوس ہوا اور نثری نظم کی، صورت میں ایک بے اعتدال رویہ بھی سامنے آیا۔ لیکن رفتہ رفتہ نظم نے روایت سے وابستہ رہ کر ایک متوازن راہ تلاش کر لی اور نئی نسل کے ناراض اور اکھڑے لہجے میں ملائمت آتی چلی گئی۔ (۱۲)

جدید نظم کے ہراول دستے میں ن-م-راشد، مجید امجد، میراجی، قیوم نظر، یوسف ظفر اور اختر الایمان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ نظم یہ سفر پوری رفتار سے طے کرنے لگی۔ اس کارواں میں مزید لوگ شامل ہوتے گئے اور اس راہگزر کو جدت و ندرت سے مزین کرتے چلے گئے، نظم کی فنی و فکری تشکیل میں نئے اضافے کرتے چلے گئے، جس نے نظم کی ایک نئی پہچان کرائی۔

ہر شاعر کے ہاں شعری فضا مختلف ہوتی ہے جس کی تخلیق میں شاعر کا لفظی نظام، علامتیں، استعارے اور حسی روّیے شامل ہوتے ہیں۔ عزیز حامد مدنی اپنے عہد کی ایک توانا آواز ہیں۔ ان کی نظم نگاری نے شاعری کو ایک ایسی جدت سے نوازا ہے جس میں روایت کی دھیمی دھیمی مہک محسوس ہوتی ہے۔ ان کے ہاں اکثر مقامات پر روایتی علامتیں، استعارے اور تراکیب پائی جاتی ہیں لیکن فکر کی ایک نئی جہت کو منظرِ عام پر لانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ شعری ادب کے آئینے میں تخلیق اور تہذیب کے درمیان قائم رشتے کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر ادب پارے میں شاعر و ادیب کی شخصیت میں تہذیبی شعور کا عکس نظر آتا ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ کوئی مصنف اپنے معاشرے میں عصری تقاضوں کی بدولت ہونے والے تہذیبی و ثقافتی تغیرات سے متاثر نہ ہو۔ عزیز حامد مدنی نے سائنسی ایجادات کے معاشرے اور تہذیب پر اثرانداز ہونے والے عوامل کو بیان کیا ہے اور جدید معاشرے کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کی ایک مختلف جہت کو نمایاں کیا ہے۔ مدنی اپنے پہلے شعری مجموعے چشمِ نگراں کی تحریروں سے پہلے "آزادی کا افق" کے زیر عنوان ایک تعارفی مضمون لکھتے ہیں، اس میں وہ رقم طراز ہیں:

> جدید تہذیب، جسے میں بغیر سائنس اور ٹیکنالوجی کے سوچ ہی نہیں سکتا، ایک نئے آدمی کا تصور پیش کرتی ہے۔ اس تہذیب نے نقد و نظر کی جو منزلیں طے کی ہیں وہ کسی تہذیب نے اتنے کم عرصے میں اتنی تیز رفتاری سے طے نہیں کی تھیں۔ رفتار، عمل، تلاش، توازن کے دور میں لکھنے والا ایک ایسے کاغذ پر لکھ رہا ہے جو شش جہت کی ہواؤں کی زد میں ہر نفس بیچ سے مڑ جاتا ہے۔ لکھنے کی اتنی تیز رفتار سمجھ کی اتنی وسعتیں کہاں سے لائے۔ (۱۳)

مدنی روحِ عصر کے تقاضوں کو پوری شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا فکری پہلو ہو جو ان کی نظر سے پوشیدہ رہ سکا ہو۔ مدنی کا طرزِ احساس اور طرزِ اظہار انھیں باقی تمام شعرا سے ممتاز کرتا ہے۔ ان کی لفظیات اپنے منفرد فکری تخیل کے ساتھ ایک ایسا ماحول تخلیق کرتی ہیں جو مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ دل کی گہرائی میں اترتے ہوئے قاری کو اپنے حصار میں جکڑ لیتا ہے۔ مدنی کی نظموں میں تشبیہات، استعارات اور علامتیں اس انداز میں آتی ہیں جسے پڑھ کر روایتی انداز ہونے کے باوجود جدت کا احساس ہوتا ہے۔ چشمِ نگراں کی پہلی نظم "انتساب" سے بند ملاحظہ کریں:

تجھے خبر ہے میری لَے نے ایک مدت سے
ہجوم گاہ میں مانندِ آتش چقماق
اسی خزاں میں جو موجِ نفس کے ساتھ گئی
ملیں گے،صورت و،صدا کے ہزارہا اوراق

دوسرا بند:

سکونِ ہجر میں بدلی ہوئی تھی آرزوئے وصال
کہ دشتِ شوق سے دامن تھا نارسیدہ بہت
تو ہی تو خلوتیِ دہر آشنا نکلی
رسومِ پردہ کشائی سے سرکشیدہ بہت[۱۴]

ان اشعار میں مدنی نے بہت خوبصورت انداز میں منفرد علامات کا استعمال کیا ہے۔ ان کے لہجے کا آہنگ بلند پرواز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ حمید نسیم کے مطابق ان کی آواز کا طنطنہ اور بلند آہنگی میں جوشؔ کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے جسے وہ کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

> مدنی جوشؔ کا مداح ہی نہیں معنوی شاگرد بھی تھا۔ مگر قدرت نے اسے بڑا جوہر عطا کیا تھا سو وہ اپنے شعری سفر کے آغاز میں بھی یہاں وہاں ایک بلند قامت شاعر سے اثر پذیری کا تاثر دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیتا ہے کہ وہ سب سے الگ طبیعت اور جدید شعور لے کر آیا ہے۔ میں نے جن نظموں سے اقتباس اوپر نقل کیے ہیں ان کا بیشتر حصہ مدنی کا اپنا ہے جو اس کے سوا اور نہ کسی نے کہا اور نہ کوئی کہہ سکتا ہے۔[۱۵]

نظم "انتساب" کا پہلا بند کچھ یوں ہے:

ہزار درد خریدے ہیں میں نے دل کے لیے
ابھی یہ پردۂ جاں ہے کہ ایک پردہ ساز
ہر اک افق سے پلٹتی ہوئی ، بکھرتی ہوئی
تجھے ہی ڈھونڈ رہی ہے ابھی مِری آواز[۱۶]

مدنی کی فکری گہرائی، علمیت اور لفظوں کی کاریگری ایک فسوں خیز ماحول بنا دیتی ہے اور وہ اپنے تخیلات کو اس حسنِ جمال کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ حسن کے رنگین پہلوؤں کو قدرتی عمل سے ہم آمیز کر سکیں۔ نظم "زندانی" کے بند دیکھیے:

تم کو دنیا نہیں دے گی غم و آلام کے جام
اک تبسم سے سنبھالے ہوئے دنیا کا نظام
روک سکتی ہو جنوں خیز ہواؤں کا خرام
تم سمجھتی ہو کہ آساں ہے جینا اپنا
سیلِ دریا سے نہ گزرے گا سفینہ اپنا

راہزنوں کا بسیرا ہے جہاں ہم تم ہیں
ہر طرف ایک اندھیرا ہے جہاں ہم تم ہیں
اور بہت دور سویرا ہے جہاں ہم تم ہیں
یہ تبسم کی سپر کام نہیں آ سکتی
راہ پر گردشِ ایام نہیں آ سکتی

کسی طوفاں کے شراروں کی طرح بہتا ہے
زخم سے خون کے دھاروں کی طرح بہتا ہے
وقت لاوے کے شراروں کی طرح بہتا ہے
اور تم گیت کی طالب---مہ و انجم کی اسیر
اک سلگتی ہوئی دنیا میں تبسم کی اسیر(۱۷)

اس نظم کے عنوان سے ہی ایک ایسے قیدی کا نقش آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جو اپنی محبوبہ سے دور قید و بند کی، صعوبتیں کاٹ رہا ہے۔ جو اپنے غم و آلام کو اپنی مسکراہٹ میں چھپانے کی ناکام کوشش میں، جب کہ اس کی محبوبہ ابھی بھی آنکھوں میں محبت کے استعارے لیے اس کی منتظر ہے۔ اس اسیری میں وہ مخبوط الحواس ہونے کے قریب ہے۔ رہائی کا کوئی روزن کھلا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اپنی محبوبہ کو حقائق کی دُنیا دکھانے کی کوشش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ہم چاروں طرف سے راہزنوں کے چنگل میں پوری طرح پھنس چکے ہیں۔ اس شب کی سیاہی اس قدر گہری ہے کہ سورج کے نکلنے کا امکان دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتا۔ ذہن و دِل اس قدر زخمی ہو چکے ہیں کہ خون کے دھارے بنتے جا رہے ہیں۔ وقت کی

سفاکیت ہم دونوں کو گرم لاوے میں پگھلنے پر مجبور کر دے گی۔ حیرت ہے، اے میری محبوبہ! تم ابھی تک خوشیوں کی آس میں پلکیں بچھائے بیٹھی ہو۔ یہ دنیا ہے میری جاں! اس گردشِ دوراں میں تبسم کی سپر کام نہیں کر سکتی۔

محبوب سے ہم کلام ہونے کا یہ انداز انتہائی دل آویز ہے جو کہ مدنی کا خاصہ ہے۔ ان استعاروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مدنی ایک مضبوط شخصیت کے حامل ہیں، جو سختیوں کو برداشت کرنے کا فن بہ خوبی جانتے ہیں۔ حمید نسیم اپنی کتاب پانچ جدید شاعر میں مدنی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> مدنی آزردہ حال یا ہار ماننے والا شخص نہیں۔ وہ راستے کی، صعوبتوں، جاں گسل مشکلات اور خطرات سے آگاہ ہے۔ لیکن اسے نوعِ اہلیت بقا پر مکمل اعتبار ہے۔ سو اس کی فکر کی اساس ایک توانا، ہمہ گیر رجائیت ہے اور اسی رجائیت نے اسے جدید تر سائنس کے قریب کر دیا ہے۔ وہ ٹیکنالوجی پر مبنی ایک عالمگیر معاشرے کے خواب دیکھتا ہے اور سائنسی تہذیبِ نو اور وحدت انسانی پر ایمان رکھتا ہے۔ لیکن نوع اپنے بے بہا سرمایہ کو رد نہیں کرے گی۔ ہومر، ورجل، سوفوکلیر، ارسطو، افلاطون، دیکارت، ہیگل، کانٹ، ڈارون، حافظ و سعدی، رومی و عطار، ابن رشد، ابن خلدون، کالی داس اور گیتا، شاہنامہ فردوسی اور پنج گنج نظامی کو ساتھ لے کر چلے گی۔ نئی تہذیب انسانی زندگی کو نئی ایجادات اور علوم جدید میراثِ بزرگاں بہم آمیزی سے ایک زندہ اور مثبت اور خوش نما، خوش آئند کل دے گی۔ یہی بات وہ نئے نئے استعاروں میں نظم میں بھی کہتا ہے۔ (۱۸)

مدنی کی جمالیاتی حس نہ صرف اردو ادب کے حوالے سے معتبر ہے بلکہ عالمی ادب پر ان کا عمیق مطالعہ اس بات کا شاہد بن جاتا ہے کہ وہ اقوامِ عالم کے مسائل، پیچیدگیوں اور معاشرتی انحطاط سے باخبر ہونے کے ساتھ ہندوستانی معاشرے کے مزاج سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ عمرانی و سیاسی اقدار، انسانی تاریخ اور عقائد سے بہ خوبی واقف تھے۔ درج ذیل بند نظم "نئے نام" سے اقتباس لیے گئے ہیں:

علم و عرفاں کی غلط بینی کا نظام
ذرّے ذرّے میں ہے افسوں روایات کا دام
کس قدر خوار یہ ہنگامہ عالم ہے تمام
ایک ذرّہ بھی زمیں کا نہیں بیدار ابھی
آہنی نیند میں ہے خاک پر اسرار ابھی

آدمی، صرف فرشتوں کا فسانہ نہ رہے

دیوتاؤں کے تبسم کا نشانہ نہ رہے
اب روایات کہن ہی کا زمانہ نہ رہے
تیرہ و تار افکار کے آسیب نہ ہوں
حرم و دیر کرامات کے آسیب نہ ہوں(۱۹)

مدنی نے جس عہد میں قلم سنبھالا دنیا میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ بہت سے نئے افکار و خیالات معاشرتی تبدیلی کے ساتھ زمین و دل کی فضا میں بھی گہرے تغیرات لا رہے تھے، جس کے باعث نئی سوچیں اور نئے ذہن پیدا ہو رہے تھے۔ جو تجربات کے باعث معاشرتی توڑ پھوڑ کے بعد اسے از سر نو منظم کرنے میں مصروفِ عمل تھے۔ نظم کا ساتواں بند دنیا میں ہونے والی خونریزی، سفاکیت، انسانی جانوں کے زیاں اور بے وقعتی کی طرف واضح اشارہ ہے۔

آدمیت کو کلاہوں کے اندھیروں نے ڈسا
امن و اصلاح کے پرچم کے سویروں نے ڈسا
سینۂ ارض کو چنگیز کے ڈیروں نے ڈسا
آؤ چنگیز کے تابوت پہ کیلیں جڑ دیں
سیل کی راہ میں آہن کی فصیلیں جڑ دیں(۲۰)

جب امن و سلامتی کے پرچم زمین بوس ہونے لگے، آدمیت کا خون سیلِ رواں کی طرح بہنے لگا تو مدنی کا حساس دل اسصورت حال پر تڑپ اٹھا اور وہ بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔ آؤ چنگیز کے تابوت پر کیلیں جڑیں یعنی اس ظلم و ستم اور کساد بازاری کے خلاف قدم اٹھائیں۔ انسانی خون کے سیلاب کے آگے ایسی مضبوط آہنی دیواریں بنا دیں، جس سے انسانیت کو بچایا جا سکے۔

مدنی نے بہت جلد فنی، فکری، اسلوبیاتی اور جمالیاتی افق کی منازل کو طے کر لیا اور اپنے ہم عصر شعرا کی صف میں کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے بہت ہی اعلیٰ پائے کی نظمیں تحریر کیں، جن میں ان کی علمیت، فکری رویے، شعری عظمت اور تخلیقی شعور کا اظہار وسیع پیمانے پر ہوتا ہے۔ نظم "تصویریں" کا پہلا بند ملاحظہ کریں:

میں نے سوچا ہے کہ خورشید کا ماتم نہ کروں
شب کی آغوش میں مے خانے ہیں، سیارے ہیں
جن کا پرتو مری بے خواب نگاہوں میں رہا

ابھی افلاک کی محراب میں وہ تارے ہیں
جو خلاؤں میں لُٹاتے رہے کرنوں کی ضیا
آتشیں ہو کے شفق روز پگھل جاتی ہے
روز نظاروں کی اک لاش سی جل جاتی ہے(۲۱)

مدنی کا بڑا ذہن ہر طرح سے، صاف (Clear) ہے، اس میں کوئی ابہام نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ مستقبل میں ترقی اور کامیابی کا زینہ کس طرف جاتا ہے اور کون سا روزن کُھلے تو افکار کی تازہ ہوا ذہن و دل کو معطر کرنے کا سامان لانے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ جدید علوم کے حصول اور ترقی کی راہ میں کون سے رسم و رواج حائل ہیں، جن سے کنارہ کشی کرنے کے بعد ہی فکری نظام میں جدت اور ندرت حاصل ہو سکتی ہے۔ ان تمام باتوں سے مدنی بہ خوبی آگاہ تھے۔ حمید نسیم اس بارے میں لکھتے ہیں:

> مدنی اپنی نظم 'تصویریں' کی ابتدا اس مصرعے سے کرتا ہے 'میں نے سوچا ہے کہ خورشید کا ماتم نہ کروں' سامع یا قاری کو زبان کھولتے ہی اپنے اپنے مستقبل کے عزائم سے ایک مصرع میں مطلع کر دینا سی پی کے نوجوان شاعروں کا پسندیدہ اسلوب تھا اور یہ جوش، صاحب کی دین ہے۔(۲۲)

اسی نظم کا ایک اور بند دیکھیے:

روز اٹھتی ہے فضاؤں میں اُجالے کی فصیل
گرتی جاتی ہے، کھنڈر ہوتی چلی جاتی ہے
موت تاریخ کے گرتے ہوئے ایوانوں میں
ابنِ آدم کا لہو چاٹ کے گھبراتی ہے
چھوڑ دوں دامنِ خورشید کو نظروں میں یہیں
شب کے خاموش اندھیرے بھی تو بے نور نہیں(۲۳)

اس کے علاوہ "چشمِ نگراں" اور بھی بہت ہی خوبصورت اور عمدہ نظمیں جن میں منفرد علامتوں، استعاروں اور تشبیہات سے لفظوں کی ایک نئی لغت سامنے آتی ہے۔ مدنی اپنے عہد کی تاریخی، سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور فلسفیانہ فکر کو اس انداز میں اپنے شعری افق کا حصہ بناتے ہیں جس سے ان کے ادبی ذوق اور ذہنی وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔ سرگوشی،

خواب گاہ، سکوت کا بن، مدفن، وقت، رات کی قبر، شہر کی شام، ملاقات، بے حسی اور یاد ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعری کی نئی علامات وضع کی گئی ہیں۔ نظم "وقت" کے استعارے ملاحظہ کریں:

کتنے رخساروں کا رنگِ آتشیں
کتنے مہ پاروں کی پابندہ جبیں
کتنے پُر آشوب جام وسانگیں
میری افسردہ نگاہوں میں رہے
قافلے گم گشتہ راہوں میں رہے

جستجو کی یہ فضائے بے چراغ
اک ہوا سے شاخِ گل بے دماغ
اک کرن سے چاند کے سینے میں داغ
ایک پرتو کا خرام بے حذر
آئنوں سے آئنوں تک ہے سفر(۲۴)

عزیز حامد مدنی نے اپنے عہد کی جو تصویریں پیش کیں، وہ کرداروں کی شکل میں ڈھلنے لگتی ہیں، بولنے والی تصویریں بن جاتی ہیں اور اپنے تہذیبی و ثقافتی زندگی کے رنگ دکھاتی ہیں۔ جدید معاشرے کی زندگی میں بڑا تضاد ہے، جو مدنی کے ہاں نمایاں نظر آتا ہے۔ مدنی نے جب لکھنا شروع کیا تو معاشرہ ایک کش مکش اور تذبذب کی کیفیت سے دوچار تھا۔ معاشرے کی اس دور کی تصویر کے بارے میں مدنی اپنے مضمون "آزادی کا افق" میں رقم طراز ہیں:

> جب میں نے زبان کھولی تو ایک طرف مہیب تاریکیوں کا دور تھا۔ دوسری طرف منتظر روشنی کے آثار ہویدا ہو رہے تھے۔ ایک طرف خندقوں میں سڑتی ہوئی لاشیں تھیں۔ آدمی لہولہان پیکر تھا۔ ساری انسانی فکر اک گہن میں تھی، دوسری طرف صدیوں کے مقفل زنداں کھل رہے تھے۔ چہروں کی گرد وقت کے آبِ تازہ سے دُھل رہی تھی۔ نوزائیدہ آزادی کی کوششِ گفتار نے دلوں کو جگا دیا تھا۔ وہ دور، ہزار ضدوں کا ایک افسانہ ہے، دو ضدوں کی ایک بے قرار روح پیدا و پنہاں، فضائے عالم پر محیط تھی۔(۲۵)

مدنی اور اس کے عہد کے شاعروں اور ادیبوں کے سامنے اہم اور پیچیدہ مسائل تھے، جس میں عالمی دنیا کے امن و امان، آزادی فرد کی ذہنی کیفیات، فکر کے نئے موڑ، معاشرتی ناہمواریوں کی جنگ نئے تقاضے اور نئی امیدیں تھیں۔ مادر

گیتی سے، انجم شناس سے، گوتم کی سرزمیں ہو یا وہ مِرا آہوئے ختن، بدلتے ہوئے عنوان، موسم کا تغیر یا دستِ حنائی تک تمام نظمیں مدنی کی علامتوں، لفظیات و تراکیب اور ذہنی معیار کی نشاندہی کرتی نظر آتی ہیں۔ چوں کہ "چشمِ نگراں" پہلا شعری مجموعہ تھا، اس لیے نظموں میں فسوں کاری اور رومانوی فضا تو پیدا ہو گئی لیکن شاید ہی کوئی نظم جو مربوط کُل کی حیثیت رکھتی ہو۔ لیکن اس مجموعے نے مدنی کو اپنے ہم عصر شعرا کے ساتھ چلنے اور مشاعروں میں شرکت کے قابل بنا دیا۔ ان مشاعروں میں وہ اپنا کلام سنا کر داد سمیٹنے لگے۔ ان کی شاعری بطور خاص نظموں سے ایک منفرد لہجے کا شاعر سامنے آتا ہے۔ جدید اسلوبِ بیان اور وسعتِ اظہار نے مدنی کی فکر اور تخیل کے رنگوں کو مزید نکھارا۔

پہلے شعری مجموعے کے دو سال بعد مدنی کا دوسرا شعری مجموعہ دشت امکان ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں بھی غزلوں اور نظموں کو شامل کیا گیا تھا۔ موضوعات میں مزید جدت پیدا ہو گئی تھی، نگاہِ تخیل بلند ہوتی چلی جا رہی تھی اور جدید اردو شاعری کے افق پر چمکنے والے ستاروں میں مدنی کا نام بھی شمار ہونے لگا تھا۔ اس مجموعے میں بھی کلام سے پہلے مدنی کا ایک مضمون بعنوان "دانشِ حاضر کے سواد میں" شاملِ تحریر ہے۔ اس ابتدائیے کو فہم و ادراک کا حصہ بنائے بغیر مدنی کے تخلیقی عمل، وجدانی کیفیات اور شعری وسعتوں تک رسائی حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ "صلیبوں کی اوٹ" ایک علامتی نظم ہے، ملاحظہ کریں:

سمٹ کے سرگوشیاں سی کرتی رہی ہے شب خوں کی حزیں رات
وہ جس کے جابر سکوت کی منتظر تھی روحِ، صبیح و سقراط
یہ اک طلوعِ سحر، صلیبوں کی اوٹ سے ، زہر کے سبو سے
افق افق آگ ندائے تازہ نفس سی ہے ساز کے لہو سے
یہ دورِ شب خوں طلوعِ مہر و ندائے شعلہ نفس کی موجیں
یہ نرم جاں روشنی کی فوجیں[۲۶]

اس نظم میں اسلوبِ بیاں اور لفظیات کا ایک انقلابر پا دکھائی دیتا ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے اس نظم میں تخلیق کار معاشرتی انحطاط، اقتصادی بحران اور عالمگیر سطح پر پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور رجحانات کا نوحہ بیان کرتا ہے۔ سامراجی قوتوں نے نو آبادیوں میں اضافے کیے۔ اس جبر و تشدد اور ظلم و ستم کے نتیجے میں نو آبادیوں میں آزادی کی تحریکوں نے جنم لیا۔ عالمی جنگوں نے ہر طرف تباہی و بربادی پھیلا دی۔ لاکھوں کی تعداد میں انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ جنگ کی ہولناکی

نے چاروں طرف خوف و دہشت کی فضا پیدا کر دی۔ ایٹمی بموں نے چند لمحوں میں جیتی جاگتی انسانیت کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ حمید نسیم اس نظم کی وضاحت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

صلیبوں کی اوٹ کا پس منظر دوسری عالمگیر جنگ ہے۔ اس کی ہولناکی، شہروں میں بے پناہ شہریوں کا بچوں، بوڑھوں، حاملہ عورتوں کا قتلِ عام، ہوائی بمباری سے، راکٹوں سے، ٹینکوں کا شہروں بستیوں کو پلک جھپکتے میں ویرانہ بنا دینا، سمندر کے پانیوں کا انسانی لہو سے سرخ ہو جانا، سب شاعر نے بیان کیا ہے۔ (۲۷)

اشعار دیکھیے:

مگر وہ گھوڑے، وہ آہنی تند و تیز گھوڑے جو بڑھ رہے ہیں
فرازِ عالم پہ آندھیوں کی طرح برابر جو چڑھ رہے ہیں
انھیں کی ٹاپوں سے سرد و جامد لہو بکھرتا چلا گیا ہے
زمیں کے سینے میں ایک چاقو کا پھل اترتا چلا گیا ہے
اور ایک فریادِ بے، صدا، صرف اس کا مرہم بنی ہوئی ہے
سکوتِ مبہم بنی ہوئی ہے (۲۸)

عزیز حامد مدنی کی نظم "رم خوردہ دریا" ایک پابند نظم ہے۔ اس میں آلات کیمیا بڑے منفرد انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ لفظوں کی تہہ داری میں معانی کا جہان ملتا ہے۔ مدنی نئی علامتوں، تازہ تر لہجے اور جدید کرداروں کو کمال، صنعت گری سے پیش کرتا ہے۔ بند ملاحظہ کیجیے:

جانِ من، سوئیاں ساعتِ تازہ دم کی ایک رم خوردہ دریا کی موجیں ہیں
ایشیا کی ہر اک ساعتِ خواب آلودہ کی سوئیاں ہیں
مگر آج بے آب دریاؤں کی طرح محروم ایک تندیِ سیل سے
ایک بے آب و دریا کے بے حس کنارے پہ بکھری ہوئی ریت
کا ایک ذرہ ہے حسن تیرا
ایک بے آب دریا کا بے حس کنارہ کہ دامن میں اس کے
نہ شبنم، بادِ، صبا ہے، نہ ایسا شجر کوئی جس کے
ثمر میں جزا اور سزا ہی کی نیرنگیاں ہوں
مگر کوئی دریا تلاطم بدوش اور کف در دہاں
آج بھی میری بے خوابیوں اور تیری نیند کے درمیاں

ایک دستک سی دیتا ہے

جان من، سوئیاں ساعتِ تازہ دم کی ایک رم خوردہ دریا کی موجیں ہیں![۲۹]

شازیہ ناہید مدنی کی حوالے سے پروفیسر غفور قاسم کا قول رقم کرتے ہوئے بتاتی ہیں:

ان کی آزاد نظموں میں جذبے کی برہمی اور احساس کے اضطراب کا رنگ نمایاں ہے۔ شاعری میں وسیع مطالعے کو بہت دخل ہے۔ ان کی شاعری جدید ذہن کی عکاس ہے اور ان کی شاعری میں میکانکی زندگی، صنعتی ماحول، سائنسی تباہ کاریوں کے خلاف شدید ردِّ عمل نظر آتا ہے۔[۳۰]

نظم "رصد گاہ" مدنی کی وجدانی نظم ہے۔ اس میں خلا کے مشاہدے نہیں کیے جاتے اور نہ ہی ستاروں اور سیاروں کے حوالے سے معلومات دی گئی ہیں بلکہ اس نظم میں گزرے ہوئے لمحوں کے سائے کسی خشک پتے کی طرح لرز رہے ہیں، جسے ہلکی سی ہوا بھی ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ نظم کا آخری بند دیکھیے:

فضائیں دشمنِ جاں ہیں ہوا حریفانہ
مزاج دانِ تغیر رہا ہے برسوں سے
یہ میرے فن کا فسردہ ملول و یرانہ
سمندروں کا مد و جزر دشت و در کا غبار
قلم سے الجھے ہوئے، صد ہزار تشنہ سوال
رم و سکوں و طلوع و غروب کی پیکار
حدیث دل میں ہوئی کس جتن سے، صرف نہ پوچھ
سمو رہی ہے ابھی نیک و بد کے ہنگامے
کن آئنوں میں رصد گاہ، صوت و حرف نہ پوچھ[۳۱]

حمید نسیم نظم "رصد گاہ" کے بارے میں لکھتے ہیں:

رصد گاہ سائنس کا لفظ ہے ادب کا نہیں ہمارے دور تر اسلاف نے اندلس، بغداد، نیشاپور اور دوسرے ملکوں اور شہروں میں رصد گاہیں قائم کیں۔ عمر خیام نے اپنی رصد گاہ میں بیٹھ کر، دور بین شیشوں سے مشاہدہ کر کے علم ریاضی کو بروئے کار لا کر جو نتائج مرتب کیے وہ سائنس کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔[۳۲]

دشتِ امکاں کی نظموں سمندر کا بوڑھا خدا، کوئی شاخ آشنا، چوہا، فرس ٹروجن، آپریشن تھیٹر، آخری ٹرام میں جدید اصطلاحات منفرد علامتوں، استعاروں اور متحرک کرداروں کو جس عمدگی، فنی، صلاحیت، مہارت اور فکری اپج

سے استعمال کیا وہ آنے والے شاعروں کے لیے ایسی تیز روشنی ثابت ہوئی جس سے ہر چیز، صاف اور واضح دکھائی دینے لگی اور فنی اظہار میں رنگا رنگی پیدا ہو گئی۔

مدنی کا تیسرا شعری مجموعہ نخلِ گُماں ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں بالترتیب دوسرے مجموعوں کی طرح نظم اور غزل دونوں اصناف میں اپنے خیالات کی آفرینی و ندرت کو، صفحہ قرطاس پر منتقل کیا۔ اس مجموعہ میں کلام سے پہلے "رُخِ تحریر" کے عنوان سے ایک مختصر مضمون ہے جو اسی سلسلۂ کلام کی ایک کڑی ہے جو "چشمِ نگراں" اور "دشتِ امکاں" کے اوراق میں موجود ہیں۔ نظم "ماہی گیروں کی بستی" کے چند اشعار ملاحظہ کریں:

اے موجِ قلزم پہ خانوادہ
تجھ سے تعلق رکھتا ہے سادہ
بازوئے شل اور قلزم کا کس بل
حفظ مراتب ، ثانی و اول
طوفاں بہ طوفاں شام اور سویرے
تو بھی ان کا ، یہ بھی ہیں تیرے
گیت ان کے سارے تو سنے ہیں
ان کے سروں نے طوفاں بنے ہیں
تیرے قدیمی ہم راز ہیں یہ
سب سے پرانی آواز ہیں یہ[۳۳]

اس نظم میں شاعر ماہی گیروں کو قلزم کے خانوادے سے تشبیہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کا تعلق تم سے بہت پرانا ہے۔ اس وسیع سمندر میں تم دونوں نے طوفانوں کی زد میں شام و سویرے دیکھے ہیں۔ اے قلزم! ماہی گیر تیرے قدیمی ہمزاد ہیں اور سب سے پرانی آواز ہیں۔ اس کے علاوہ سارقوں کی کشتیاں، روحِ عصر، تغیر، تازہ تر، پروفیسر بی ٹائین کے لیکچر، پکاسو کا کبوتر، کاکلِ وقت اور شاخِ مرجاں مدنی کی جدت پسندی، شاعرانہ عظمت، مشرقی تہذیب پر نئے تغیرات کے منفی اثرات اور سامراجی خداؤں کی سازشوں کی طرف بر بلیغ اشارہ ہے۔ نظم "سارقوں کی کشتیاں" سے اقتباس ملاحظہ کیجیے:

یہ سمندر ، یہ ہوا کا نم ، یہ خوابیدہ فضا

روحِ قزاقانِ عالم کا ہے ساحل سے خطاب
سارقوں کی کشتیوں پر تیرگی ہے ایک نقاب
دور تک ان کے جہاز اور ان کے رخ پر چھائیاں
راہ گزارِ وقت پر ہیں حادثوں کی کھائیاں
رات کی دیوار وقت بے مروت کا ہدف
دیو دیدہ چشمِ ساحل خواب وحشت کا ہدف[۳۴]

اس نظم میں مدنی نے سامراجی طاقتوں کی سازشوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ عہدِ جدید میں جو معاشی، معاشرتی اور اقتصادی بحران پیدا ہوا ہے، اس کی جھلکیاں اس نظم میں دکھائی گئی ہیں۔ مدنی کی نظم کے بارے میں سرور جاوید لکھتے ہیں:

> مدنی کی نظم میں ان کا پورا فکری نظام جھلک دکھاتا ہے کہ ان کی فکر میں مشرق و مغرب کے سارے نغمے بھی ہیں اور سائنسی علوم کا مطالعہ بھی، سائنس کے جدید طرزِ معاشرت پر اثرات اور ان کا شعور بھی مدنی کے شعری افق کا حصہ ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ نظم میں مدنی کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی جس کے وہ مستحق تھے۔ تاہم عہدِ جدید میں سائنسی ایجادات کے طور پر معاشرے اور معاشرت پر اثر انداز ہونے کے بعد تشکیل پانے والے نئے ادبی رجحانات اور نئی ادبی تخلیقات نئے زمانوں میں جس طرح اثر انداز ہونے والی ہیں، وہ جدید فکر و فن کے دروازے پر دستک دے رہی ہے۔ وہ دروازے ان ہی راستوں پر کھلتے ہیں جن کی نشاندہی مدنی کی شاعری میں موجود ہے۔[۳۵]

عزیز حامد مدنی نے نظم "چوہا" میں بڑے شہروں کے تنگ و تاریک مکانوں میں زندگی کے شب و روز گزارنے والے انسانوں کی بے بسی اور حالتِ زار کو بیان کیا ہے۔ نظم دیکھیے:

مونس شب رویہ دزدانہ خرام
پارہ ہائے نان کی پیہم تلاش
ہر نفس الجھی ہوئی فکرِ معاش
عجز ہے تیرا کوئی خیالی نیام
روح کی شمشیر جوہر دار سے ہے
سب سے محروم تیرے، صبح و شام
روح تاریکی میں پلتی ہی نہیں

جذب کر لیتی ہے سفاکی کے ساتھ
تیرگی ادراک کا جغرافیہ
یہ ندی رخ تو بدلتی ہی نہیں
مفلسی کیسرد اندھا آئینہ
دیکھنے دیتا جو چہرے کی خراش
جسم میں مانند برف بے اماں
روح کی شمشیر کا جوہر کہیں
ٹوٹ سکتی تھیں بہت پابندیاں
تجھ سے وابستہ بلوں کی تیرگی
تیرگی میں اک گراں حبسِ دوام
جاں کنی کی گود میں سمٹا ہوا
نگہت افلاس کا جغرافیہ
ایک خورد و ماس میں لپٹا ہوا(۳۶)

مدنی کی نظموں میں بڑے شہر کی زندگی کو بڑی جامعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ بڑے شہر کی تنگ و تاریک گلیوں میں زندگی کے ایام اس طرح گزرتے ہیں کہ انسان قدرتی مناظر سے دور ہو کر تیل اور دھویں کی فضا میں سانس لیتا ہے۔ اس کرب آلودہ تنفس کے ساتھ وہ شب و روز کی سختیاں برداشت کرتا ہے لیکن غمِ دوراں ہے کہ طویل ہی ہوتا جاتا ہے، کوئی راہِ فرار نہیں ملتی۔

صنعتی ترقی نے ماحول کو آلودہ کر دیا ہے اور انسان اس دھویں بھری فضا میں رہنے پر مجبور ہے۔

عزیز حامد مدنی "آزادی کا افق" میں لکھتے ہیں:

میری نظموں میں بڑے شہر کی زندگی ہے، اس کا تضاد ہے، اس کی بے روح و سفاک، تند و تیز میلانات کی علامتیں ہیں۔۔۔۔ اس کی ثقافتی و تہذیبی زندگی ایک مختلف نہج کی ہے۔ اس میں آپریش تھیٹر ہیں، اس میں پٹرول پمپ کے بے خواب سٹیشن ہیں ریلوے ورکشاپ ہے، درس گاہوں کے اندھیرے ہیں، ستونوں کی بڑی بانھوں میں آدمی پچک گیا ہے۔(۳۷)

اس نظم میں چوہا ایک ایسا غریب انسان ہے جو خستہ حال جھونپڑیوں اور چھوٹے مکانوں میں رہائش پذیر ہے۔ غربت اور بھوک اس کا مقدر بن چکی ہے۔ لیکن اس کے وجود میں لگن ہے، وہ پارہ ہائے نان کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ حمید نسیم نظم "چوہا" کے تناظر میں لکھتے ہیں:

> میرا بیشتر وقت نانِ جویں کی تلاش میں، صرف ہوتا آیا ہے۔ نصف، صدی سے ایک تنگ، تاریک، اونچی چھ منزل عمارت کے گراؤنڈ فلور میں ایک بل جیسے فلیٹ میں رہتا ہوں جہاں لوڈشیڈنگ سے، جو اکثر رات بھر جاری رہتی ہے، نڈھال رہتا ہوں اس نظم میں مجھے اپنا وجود، اپنا چہرہ نظر آیا۔ مجھے لگا مدنی نے میرے جیسے کروڑوں انسانی چوہوں کے کلفت و افلاس کا جغرافیہ بڑے دُکھ اور احساس کی، صداقت کے ساتھ بیان کیا ہے۔[۳۸]

شعر و ادب کی روایت میں جدت و ندرت کے جو نقوش بڑے شاعروں میں دکھائی دیتے تھے وہ موجودہ عہد میں مدنی کی شاعری کا خاصا بن گئے۔ اسی انفرادی خصوصیت کی بنا پر ان کا شمار منجھے ہوئے اہلِ قلم میں ہونے لگا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جدید اصطلاحات، تراکیب اور سائنسی لفاظی کو اس طرح برتا ہے کہ معانی کی ایک لغت ہمارے سامنے آتی ہے، جس کی تہ میں اترنے کے لیے ہمیں مدنی کی طرح بڑے ذہن اور جدت پسندی کا قائل ہونا پڑے گا۔ مدنی فکری اعتبار سے غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کے قریب قریب نظر آتے ہیں لیکن ان کا اسلوب سخن اور اندازِ بیانا نھیں دوسرے شاعروں سے منفرد بناتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ظفر سعید سیفی،عزیز حامد مدنی:فن، فکر اور فنکار،(سفی پبلشنگ ہاؤس ۲۰۱۲ء)،ص ۱۰۔

۲۔ ایضاً،ص ۱۷۔

۳۔ گنجینہ ادب/https://m.facebook.com،۱۸،۲۰:۰۶اپریل ۲۰۲۰ء۔

۴۔ عزیز حامد مدنی ادب کی تاریخ ہمیشہ زندہ رہے گیhttps://jang.com.pk،۱۸،۱۰:۰۸اپریل ۲۰۲۰ء۔

۵۔ ایضاً،ص ۱۔

۶۔ ایضاً،ص ۲۔

۷۔ ایضاً،ص ۲۔

۸۔ ظفر سعید، سیفی،مرتبہ کلیات عزیز حامد مدنی،(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص ۳۶۸۔

۹۔ احمد جاوید کے لیکچرhttps://toutu.be،۱۲:۵،۱۶اگست ۲۰۲۱ء۔

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ رشید امجد،ڈاکٹر،پاکستانی ادب، رویے اور رجحانات،(اسلام آباد:پورب اکادمی، جنوری ۲۰۱۰ء)،ص ۳۳۔

۱۲۔ ایضاً،ص ۳۶۔

۱۳۔ ظفر سعید، سیفی(مرتب)،کلیات عزیز حامد مدنی،(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص ۲۲،۲۳۔

۱۴۔ ایضاً،ص ۳۳،۳۴۔

۱۵۔ حمید نسیم،پانچ جدید شاعر،(فضلی سنز،۱۹۹۴ء)،ص ۲۶۰۔

۱۶۔ ظفر سعید، سیفی(مرتب)،کلیات عزیز حامد مدنی(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص ۳۳۔

۱۷۔ ایضاً،ص ۳۶،۳۵۔

۱۸۔ حمید نسیم،پانچ جدید شاعر(فضلی سنز،۱۹۹۴ء)،ص ۲۶۱۔

۱۹۔ ظفر سعید، سیفی(مرتب)،کلیات عزیز حامد مدنی(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص ۴۰،۳۹۔

۲۰۔ ایضاً،ص ۴۱۔

۲۱۔ ایضاً،ص ۴۹۔

۲۲۔ حمید نسیم،پانچ جدید شاعر،(فضلی سنز،۱۹۹۴ء)،ص ۲۶۰۔

۲۳۔ ظفر سعید، سیفی (مرتب)، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۴۰۔

۲۴۔ ایضاً، ص ۶۵، ۶۶۔

۲۵۔ ایضاً، ص ۳۰۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۷۱۔

۲۷۔ حمید نسیم، پانچ جدید شاعر (فضلی سنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۲۷۳۔

۲۸۔ ظفر سعید، سیفی (مرتب)، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ۱۶۸۔

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۷۶۔

۳۰۔ شازیہ ناہید، شفاعت، نظم جدید اور فضا اعظمی کی طویل نظم نگاری (مقالہ برائے ایم اے اردو، نقش پبلی کیشنز کراچی، ۲۰۰۸ء)، ص ۱۱۳، ۱۱۴۔

۳۱۔ ظفر سعید، سیفی (مرتب)، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۸۳۔

۳۲۔ حمید نسیم، پانچ جدید شاعر، (فضلی سنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۲۸۱۔

۳۳۔ ظفر سعید، سیفی (مرتب)، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۸۳۔

۳۴۔ ایضاً، ص ۵۱۴۔

۳۵۔ سرور جاوید، "عزیز حامد مدنی۔۔۔ طرز مرصع کا نیا اسلوب" مشمولہ اردو نظم کی عظیم روایت (کراچی: رنگ ادب پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۳۰۹۔

۳۶۔ کلیات عزیز حامد مدنی، مرتبہ، ظفر سعید سیفی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۹۵، ۱۹۶۔

۳۷۔ کلیات عزیز حامد مدنی، مشمولہ، آزادی کا افق، (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۳۰۔

38۔ حمید نسیم، پانچ جدید شاعر (فضلی سنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۲۷۳۔

باب سوم:

عزیز حامد مدنی کی نظم میں سائنسی ایجادات پر رد عمل

باب سوم:

عزیز حامد مدنی کی نظم میں سائنسی ایجادات پر ردِ عمل

تجسس انسان کی فطرت میں رب تعالی کی پیدا کردہ، صفات میں ایک اہم صفت ہے، انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ ثبات اور جمود کو پسند نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے انسان کائنات میں موجود ہر شے کے بارے میں متجسس ہے اور اس کے سربستہ رازوں کو منکشف کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ کائنات کی تخلیق اور اس کے اسرار و رموز ہمیشہ سے انسانی جستجو کا محور و مرکز رہے ہیں۔ اس کائنات میں انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جسے عقل و شعور اور فہم و فراست کی نعمت عالیہ سے نوازا گیا ہے، اسی شعور اور تعقل کی بنا پر وہ کرۂ ارض کی تمام مخلوقات سے افضل درجے پر فائز ہے۔

ہماری کائنات اربوں سال پہلے وجود میں آئی تھی۔ تاریخ علوم انسانی میں کائنات کے متعلق بے شمار نظریات اور مباحث پائے جاتے ہیں۔ ابتدا میں انسان سوچتا تھا کہ یہ کائنات، صرف ہمارے سیارے تک محدود ہے اس لیے انسانی جستجو اور تلاش کا مرکز زمین، آسمان اور انسان ہے تاہم وقت کے ساتھ اس میں شعوری سطح پر تبدیلیاں رونما ہونے لگی۔ انسانی تاریخ قدیم زمانے سے جدید تہذیب کی طرف ارتقائی سفر طے کرنے لگی پرانا طرز زندگی بدلنے لگا، نئے افکار اپنی جگہ بنانے لگے۔ کائنات فہمی کے عمل میں انسان ترقی کے زینے چڑھتا ہوا دورِ حاضر تک آن پہنچا۔

انسانی زندگی کے ارتقائی سفر کے حوالے سے ظفر سعید سیفی لکھتے ہیں:

> انسانی زندگی اپنے ارتقا کے لیے نرم و نازک دھاگوں کی ایک مضبوط ڈور بنا کرتی ہے۔ ابتدا میں یہ ڈور سیاہ تھی، سیاہ ڈور تاریکی، طلسمی اور اساطیری عہد کی نشاندہی کرتی ہے۔ اس کے بعد سرخ ڈور کا سلسلہ شروع ہوا، یہ ڈور مذاہب عالم اور انسانی کش مکش کی غماز ہے۔ اس کی بعد سفید دودھیائی ڈور کا جوڑ لگا، جو سائنسی عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ ہم ابھی تک سفید ڈور کے دور میں جی رہے ہیں۔ یہ معلومات، خبر اور ترسیل کے دائرے میں مابعد الطبیعیاتی زمانے کی خبر دے رہا ہے[1]

مجموعی طور پر سائنسی طرزِ فکر نے حیاتِ انسانی کے تہذیبی و مذہبی تصورات، عقائد اور معاشرتی اقدار کا رُخ ایک نئی سمت میں موڑ دیا ہے۔ مادی ترقی کی بدولت ایسی سائنسی ایجادات اور اختراعات منظرِ عام پر آچکی ہیں جنھیں دیکھ کر انسانی عقل حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ہوا، پانی، آگ اور روشنی جیسے عناصر کا سائنسی استعمال میں لا کر بنی نوع انسان کے لیے اَن گنت آسائشیں اور راحتیں پیدا کی گئی ہیں۔ جدید ٹیکنالوجی اور نت نئی ایجادات کی تخلیق اور استعمال

سے دنیا اگرچہ گلوبل ویلج بن چکی ہے لیکن اس مادی و سائنسی ترقی کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والے معاشروں میں عالمگیر تہذیبی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ عقلیت کے تسلط اور روشن خیالی کی اس لہر نے مذہب، سیاست، سماج اور افراد کے باہمی اور دیرینہ تعلقات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں پر مادیت کا غلبہ قائم ہو چکا ہے جس نے روحانی زوال اور بے حسی کے جذبے کو فروغ دیا ہے۔ ایسے عہد میں جذباتی زندگی اور انسانی رشتوں کی نوعیت بدل چکی ہے۔ انسان ناآسودگی اور نامرادی کے احساس سے دوچار ہے۔ ان حقائق کے زیرِ اثر فرد ذہنی، جذباتی، نفسیاتی الجھنوں اور عدم تحفظ کی کیفیت میں گھر چکا ہے۔

مادی ترقی سے انسانی ذہن پر ہونے والے منفی اثرات کے بارے میں شمیم حنفی لکھتے ہیں کہ:

> مادی ترقیوں کی طرف سے بے اطمینانی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ انھوں نے تہذیب کی معصومیت کو، صدمے پہنچائے اور وہ فضا پیدا کی جس میں انسان کی قوتیں جسمانی آسائشوں کے حصول کی کوشش میں، صرف ہوتی رہی ہیں اور رفتہ رفتہ وہ فطری زندگی سے دور ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جنگ اور استحصال کی قوتیں اس کی فطری توانائیوں پر غالب آکر اس کے وجود کو مسخ کر دیتی ہیں۔ (۲)

بیسویں صدی میں سائنس کے کمالات اور نارسائیوں کا عملی ثبوت عالمی جنگوں کی صورت میں سامنے آیا۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کا سحر ٹوٹنے لگا۔ مادی ترقی کے حوالے سے انسان کی خوش عقیدگی کو کاری ضرب لگی اور وہ روحِ تہذیب کو مٹانے والے عناصر کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہوا۔

دن بہ دن سائنس کی ہلاکتوں اور تباہ کاریوں نے زندگی کی لایعنیت میں اضافہ کیا ہے۔ اس بھیانک حقیقت کا احساس شدت اختیار کر رہا ہے کہ انسان اپنی جوہری طاقت سے نسلِ انسانی کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی قدرت رکھتا ہے۔ شمیم حنفی نے عالمی جنگوں سے پیدا ہونے والے اثرات کو اپنی تصنیف **جدیدیت اور نئی شاعری** میں کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے:

> پہلی اور دوسری عالمی جنگ کی ہولناک تباہی نے انسان کو اجتماعی موت کے ایک المناک احساس سے دوچار کیا جس کی جڑیں اس کے وجود میں پیوست ہو گئیں۔ اس کی فکر کا نظام بکھر گیا اور کئی ایقانات کو ٹھیس پہنچی۔ اس میں نئے سرے سے اپنی تہذیب کا محاسبہ کرنے کی تحریک پیدا ہوئی اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ان جنگوں نے کئی قدروں کو بے معنی اور کئی الفاظ کو بے روح کر دیا ہے۔ یہ قدریں اور الفاظ اس کا تہذیبی ورثہ ذہنی سہارا تھے اور یہ جنگیں اس کی جبلت کا اظہار نہیں بلکہ تہذیب کی غلط روی اور اقدار کی شکست کا نتیجہ تھیں۔ (۳)

اس عالمی منظر نامے نے انسان کے ذہن و دل میں بے شمار سوالات کو جنم دیا۔ فرد کے باطن میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس کشمکش حیات کے دوررس اثرات بیرونی دنیا پر بھی پڑے۔ جدید تہذیب کی گھٹن میں معاشرتی روّیوں اور فکری زاویوں کا دھارا بدلنے لگا۔ ان رویوں نے جہاں زندگی کی تمام جہات کو متاثر کیا وہیں شعر و ادب، فن اور جمالیاتی تصورات میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ ادب میں خصوصاً شاعری کے افکار، موضوعات اور ہیئت کی رنگا رنگی میں اضافہ ہونے لگا۔ اس ساریصورت حال نے ایک نئے انسان کو جنم دیا جو انسانی وجود کی حقیقت اور معاشرتی تغیرات کو موضوع سخن بنانے لگا۔

اردو شاعری میں سائنسی تغیرات اور جنگوں کے اثرات کی واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اردو نظم نگاری کی روایت میں جن شعرا نے بیسویں صدی کے ہنگاموں، تحریکوں، جغرافیائی تبدیلیوں، عالمی سامراجیت اور انسانی زندگی کی لایعنیت کو موضوع بنایا ہے۔ ان میں اقبالؔ، جوشؔ، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ن۔ م۔ راشد، اختر الایمان، مختار صدیقی، شہزاد احمد اور عزیز حامد مدنی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

عزیز حامد مدنی نے ایسے عہد میں آنکھ کھولی جو جنگِ عظیم دوم، سائنسی انقلاب، ایٹم کی دریافت اور اس کی تباہ کاریوں سے موسوم ہے۔ اس عہد کی زندگی اپنے تہذیبی، سیاسی، سماجی، عقلی اور سائنسی رجحانات سے ہم آمیز نظر آتی ہے۔ ایک صاحبِ علم شاعر کا ان سائنسی و فکری نظریات سے متاثر ہونا لازمی امر ہے۔ مدنیؔ کا شمار ایسے شعرا میں ہوتا ہے جو اپنے زمانے کے افکار و خیالات، نظریاتی بلندیوں، معاشرتی تضادات، کشت و خون کے ہنگاموں، ادب کی وسعتوں اور سائنس و ٹیکنالوجی کے موضوعات کو اپنی نظموں کا حصہ بناتے ہیں۔ جدید فکر کے اظہار کے لیے وہ نئی تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کا استعمال کرتے ہیں۔

مدنی "دانشِ حاضر کے سواد میں" میں لکھتے ہیں:

> "جدید فکر شعر و ادب میں مختلف تشبیہوں، مختلف استعاروں اور علامتوں کے ساتھ آئی ہے۔ جدید فکر کوئی ایک دن کا کام نہیں ہے۔ اُنیسویں صدی کے سخت گیر نظام نے جب اپنا وقت پورا کر لیا اور اُس کا شیرازہ منتشر ہونے لگا تو زندگی کے مختلف شعبوں کو ایک عظیم فکری انقلاب نے متاثر کرنا شروع کیا۔ پارینہ مسلمات پارہ پارہ ہو گئے۔ بنیادی قصہ سرشتِ زندگی کی تعبیر کا تھا۔ ان سیاسی و سماجی رجحانات کے علاوہ جنہوں نے پورے معاشرے کو تبدیل کر دیا تھا جس فکری انقلاب نے دانشِ حاضر کو ایک اپنا نام دیا ہے وہ سائنس کی دنیا سے متعلق تھا۔"(۴)

ذیل میں مدنی کی نظموں میں سائنسی ایجادات اور جدید ٹیکنالوجی سے ہونے والی تبدیلیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جدید ایجادات نے کس طرح ہماری تہذیب و ثقافت، افکار، رہن سہن اور اخلاقی اقدار کو متاثر کیا ہے، ان تمام پہلوؤں کو دیکھا گیا ہے۔ عزیز حامد مدنی کی شاعری میں سائنسی ایجادات پر ایک خاص رد عمل نظر آتا ہے، جو ان کی نظموں میں نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔ نظم "صلیبوں کی اوٹ میں" سے اقتباس ملاحظہ کریں:

ہوا کی زد میں لرزتا پرچم
سکون و شورش کا ایک سنگم
شکن شکن اسکی پردہ در ہے جلال انگیز کروٹوں کی
ہر ایک جنبش کھلی ہوئی شاہراہ ہے بے تاب آہٹوں کی
کواڑ بند ہیں اور حویلی میں شمع کی کوئی لو نہیں ہے
غبارِ راہ سے اٹی ہوئی ہے کھڑکیوں میں جنبش کی رو نہیں ہے
متھے ہی جاتے ہیں سرد جھونکے مگر اسے آ کے ہر نفس میں
یہ روح آزاد ہے قفس میں (۵)

پہلے مصرع میں ہوا کی زد میں لرزتا پرچم قومی حمیت و یک جہتی کی علامت ہے۔ قومیں ہمیشہ اپنا پرچم سربلند رکھتی ہیں۔ جب بھی کوئی سرزمین فتح کی جاتی ہے تو اس پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا جاتا ہے تاکہ دشمن کو پتا چل سکے کہ شکست اس کا مقدر بن چکی ہے۔ اس نظم میں دوسری عالمی جنگ سے ہونے والی تباہی و بربادی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ شہر کے شہر ویران ہو چکے ہیں، سڑکیں اور شاہراہیں سنسان پڑی ہیں۔ ہلکی سی آہٹ بھی دل کو دہلا کر رکھ دیتی ہے۔ ہر طرف خوف کے سائے منڈلا رہے ہیں کہ دشمن کی فوج پناہ گاہوں کو تلاش کر کے حملہ آور نہ ہو جائے۔ حمید نسیم اس نظم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> صلیبیوں کی اوٹ میں کا پس منظر دوسری عالمگیر جنگ ہے۔ اس کی ہولناکی شہروں میں بے گناہ شہریوں کا، بچوں بوڑھوں کا، حاملہ عورتوں کا قتلِ عام، ہوائی بمباری سے، وی راکٹوں سے، ٹینکوں کا شہروں، بستیوں کو پلک جھپکتے میں ویرانہ بنا دینا۔ سمندر کے پانیوں کا انسانی لہو سے سرخ ہو جانا، سب شاعر نے بیان کیا ہے۔ (۶)

عزیز حامد مدنی کہتے ہیں جنگ کے سیاہ بادلوں نے تمام شہر کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ چاروں طرف حبس اور گھٹن کی فضا ہے۔ سانس لینا بھی محال ہوا جاتا ہے۔ تاریکی کے سائے تمام گھروں کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ کواڑوں کو بند کر کے روشنیاں گُل کر دی گئی ہیں، تاکہ دشم فوج کو پناہ گاہ نظر نہ آئے۔ ٹینکوں کی بمباری اور بارود کے گرد و

غبار سے کھڑکیاں سیاہ ہو چکی ہیں اور تیز ہوا کے سرد جھونکے اسے ہلکی سی جنبش دینے سے بھی قاصر ہیں۔ انسانی روح آزاد ہونے کے باوجود قید ہے اور قفس اس کا ٹھکانہ بن چکا ہے۔

دوسرا بند:

یہ اک مقفل کواڑ پر دستکوں کی اک خوں چکاں کہانی
یہ ربط لوح و قلم سے اک زندہ افکار کی کہانی
یہ اک ہمکتا ہوا سمندر ہے جزرومد اس کا کس کے بس میں
یہ موج طوفاں کہ محو بازی گری ہے انبار خار و خس میں
یہ ایک کشتی کہ اپنے دامن میں امن ساحل لیے ہوئے ہے
سکون منزل لیے ہوئے ہے(۷)

عزیز حامد مدنی امن پسندی کے قائل ہیں۔ وہ خانہ جنگی کی اس صورت حال سے خائف ہیں۔ انسانیت کا درد انھیں مضمحل کیے ہوئے ہے۔ اپنی شاعری میں وہ جنگ سے ہونے والی تباہ کاریوں پر نوحہ کناں ہیں۔ جدید سائنسی ایجادات میں جنگی آلات اور ایٹم بم چوں کہ انسانیت کی موت اور شہروں کی تباہی کا سبب ہے، اس لیے مدنی ان ایجادات اور ایسی سائنسی ترقی کے خلاف آواز اٹھاتے نظر آتے ہیں، جو انسانی جانوں کے زیاں کا سبب ہے۔ نظم "آپریشن تھیٹر" میں بھی جنگ کے اثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ذیل میں بند ملاحظہ ہو:

جنگ، افلاس، قحط، بے کاری
بے حسی کی فصیل اور انساں
حادثوں کی یہ تنگ دیواری
دور تک اب محاذِ خاموشی
تیر جوڑے ہوئے غنیموں کی
چار سو خندقوں میں روپوشی
درد کے سیلِ بے پناہ میں ہے
ہر جری اک رزم گاہ میں ہے(۸)

جنگوں نے ہمیشہ انسانوں کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ جنگوں سے، صرف انسانی جانوں کا زیاں ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ بھوک، افلاس، غربت، قحط اور بے کاری و بے روزگاری جیسی آفتیں انسان کو ایک طویل مدت تک گھیرے

رکھتی ہیں۔ جنگوں نے انسانوں کے ساتھ ماحول کو بھی ایک ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ سمندر، دریا، جنگل، پہاڑ اور زرخیز زمینیں جنگی تباہ کاریوں کی وجہ سے اپنا وجود کھو بیٹھی ہیں۔ فضا سے بمباری کرتے جنگی طیارے خوف و دہشت پھیلانے کے ساتھ ہرے بھرے کھیتوں کو بنجر زمینوں میں بدل دیتے ہیں۔ جوہری دھماکوں سے بڑی بڑی چٹانوں کو روئی کے گالوں کی طرح اڑا دیا جاتا ہے۔ اس خانہ جنگی کے ماحول میں نوعِ انسانی کی بربادی کے ساتھ قدرت کے عطا کردہ تحفوں کو بھی بھسم کر دیا جاتا ہے۔

ظفر سعید سیفی لکھتے ہیں:

> جوہری عہد نے جہاں انسان کو ادراک و آگہی کی آفاقی قدریں بخشی ہیں وہیں اس کی راتوں کی نیندوں کو بھی حرام کر دیا ہے۔ کیوں کہ ہر ذرہ بذاتِ خود سورج ہے اور اس زمین میں ہے کروڑوں سورج موجود ہیں، ان لاکھوں سورج کی توانائی اور حدت تخریبی کاموں کی نذر ہو گئی تو راتوں کی نیند اچاٹ نہ ہو گی تو کیا ہو گا۔(۹)

سائنسی ترقی نے جہاں انسان کو بہت سی سہولیات اور آسانیاں فراہم کی ہیں، وہاں طرزِ جنگ و جدل بھی عطا کیا ہے۔ موجودہ دور میں ٹینکوں، میزائلوں، آبدوزوں، لڑاکا طیاروں، دستی بموں اور جدید عسکری آلات کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے، جس سے لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کی جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ جوہری تابکاری کا استعمال وجودِ انسانی کو صفحہِ ہستی سے مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ نیز لاکھوں کی تو داد میں لوگ سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایک ہی ایٹم بم سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ میں امریکا نے جاپان کے شہروں ناگاساقی اور ہیروشیما پر ایٹمی حملہ کیا تھا، جس سے لاکھوں افراد پلک جھپکنے میں، صفحہِ ہستی سے مٹ گئے تھے۔ آج بھی ان زمینوں پر فصلیں نہیں اگتیں، جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ کسی نہ کسی جسمانی معذوری کا شکار ہوتے ہیں۔ ایٹم بم کی ہلاکت آفرینی اور تباہ کاری کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عبدالستار اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں:

> بیسویں، صدی میں ۱۶۵ بڑی جنگوں میں ۱۶۵ ملین سے لے کر ۲۵۸ ملین تک انسان ہلاک ہوئے۔ جنگ مخلاف ویب سائٹ Environmentalists Against War کے مطابق بیسویں، صدی میں پیدا ہونے والے تمام انسانوں میں سے چھ اعشاریہ پانچ (۶.۵) فیصد کی موت کی ذمہ دار جنگیں اور مسلح تصادم بنے۔ پہلی عالمی جنگ کی وجہ سے آٹھ اعشاریہ چار (۸.۴) فوجی اور پانچ ملین شہری ہلاک ہوئے جب کہ دوسری عالمی جنگ نے سترہ ملین فوجیوں اور چونتیس ملین شہریوں کی زندگیوں کے چراغ گُل کر دیے۔ جدید جنگوں میں مارے جانے والے 75 فیصد لوگ عام شہری تھے۔(۱۰)

تاریخی جنگوں پر نگاہ ڈالی جائے تو ایک دور وہ بھی تھا جب جنگ کے بڑے بڑے ہتھیار تیر کمان، نیزہ، تلوار، ڈھال، خنجر، برچھا اور بھالا تھے۔ اس دور کے سپاہی جسمانی قوت کی بنا پر آلاتِ جنگ کا استعمال کرتے تھے۔ ایسی جنگوں میں ہلاکتوں اور تباہی کا گراف موجودہ عہد کی جنگوں سے بہت کم تھا۔ آج سائنس و ٹیکنالوجی نے بہت ترقی کر لی ہے۔ عسکری آلات میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ عہدِ قدیم کی نسبت دورِ جدید میں جنگ کسی قیامت سے کم نہیں ہوتی۔ عزیز حامد مدنی جنگ کی تمام، صورت حال کو اپنی نظم میں انتہائی کرب و اذیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ پے در پے ہلاکتوں اور ماحول کی تباہی نے انسان کو بے حس کر دیا ہے۔ جنگ کی تیاری میں تمام فوجی خندقیں کھود کر اس کو جائے پناہ بنائے ہوئے ہیں۔

نظم "آپریشن تھیٹر" کا آخری بند دیکھیے:

تیغ کی دھار موڑ دیتی ہے
ضربِ ہر کرمِ زیر آگیں کی

آہنی ڈھال توڑ دیتی ہے
ایک ذوقِ طلب سے جلتا ہے
سینۂ زندگی کا زخم ابھی
سببِ بے سبب جلتا ہے
قصۂ زخم و اندمال نہ پوچھ
جنگ جاری ہے ہم خیال نہ پوچھ(۱۱)

مدنی نے اپنے عہد کی تاریک اور حبس زدہ فضا کو اپنی نظموں میں مہارت اور عقلی شعور کے ساتھ پیش کیا ہے کہ عالمی جنگوں کا تمام منظر نامہ پوری جامعیت کے ساتھ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ مدنی کی سائنسی حسیت کو وہ اوجِ کمال حاصل ہے جس نے اپنے عہد کی سائنسی ایجادات کے فوائدِ کثیر بتانے کے ساتھ ساتھ ان کی ہلاکت آفرینی کو بھی موضوعِ سخن بنایا۔ جو ان کے عصری شعور کی کامل تصویر پیش کرتا ہے۔ نظم "حفظِ کشت" میں اسی منظر نامے کی ایک کڑی ہے، بند دیکھیے:

مٹ نہ جائیں نمو کے یہ آثار
کم نہادانِ شوق نکلے ہیں

توڑنے خوشہ درست عیار
آب و گل کی یہ بارگاہ وصال
آشنایانِ عالمِ فطرت
بے سپر کھیتیوں کا کچھ تو خیال
یہ ہوا تیز تر نہ چل جائے
آدمی ہی تو ایک پودا ہے
حاصلِ کشت ہی نہ جل جائے[۱۲]

عزیز حامد مدنی نے اس نظم میں انسان کی کم فہمی، کج روی اور مفاد پرستی کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ جیسے جیسے دنیا میں آسائشیں بڑھ رہی ہیں، انسانی ضرورتیں بھی اسی رفتار سے بڑھتی جارہی ہیں۔ وہ ان آسائشوں کے حصول کے لیے جائز و ناجائز میں تمیز بھول چکا ہے اور ہر وہ چیز حاصل کرنے کے لیے کمربستہ ہے، جو اس کے کسی کام آسکتی ہے۔ مدنی اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنے شوق کے حصول کی خاطر انسان ہر حد سے گزرنے کو تیار ہے۔ جدید سائنسی ایجادات جہاں انسان کو نفع بہم پہنچاتی ہیں وہاں ان سہولتوں کا خراج بھی وصول کرتی ہیں۔ تقریباً دنیا کے تمام ممالک میں جدید سہولیات سے مزین آلات بنائے جاتے ہیں اور ان کی خرید و فروخت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہر ملک اسلحہ سازی اور آلاتِ حرب بنانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں ہے۔ یعنی ہر ملک میں کچھ نہ کچھ ہلاکت انگیزی کا سامان تیار ہو رہا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ جب ان جدید سائنسی ایجادات کا استعمال کی جائے گا تو کیا کیا نقصان اٹھانا پڑیں گے۔ ابو بکر اپنے مضمون "سماجی شعور اور سائنسی ترقی" میں لکھتے ہیں:

> سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی صرف سہولتیں نہیں لاتی بلکہ نئی اور پیچیدہ ذمہ داریاں بھی ساتھ لاتی ہے۔ انسان نے ترقی کے حاصلات سمیٹنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن متوازی ذمہ داریاں قبول کرنے سے پہلو تہی برتی ہے۔ جدید سائنس فطرت کو مسخر کرنے کا عزم تھا لیکن یہ اتنی سادہ بات بھی نہیں۔ ہم نے خزانے کی تلاش میں ہر طرف کھدائی کی، مال ہاتھ لگا مگر ان گنت زمین برد آسیب بھی رہا ہو گئے۔ ہر سوراخ میں انگلی گھسیڑنے سے سانپ کے کاٹے کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ فطرت کو مسخر کرنے کی نفع پرست جدوجہد نے فطرت کی نامانوس ہیبت ناکیوں کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔[۱۳]

اس لیے مدنی کہتے ہیں کم نہادانِ شوق ایجادات میں مصروف ہیں اور دنیا کے قدرتی نظام میں خلل ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس شوق میں وہ ہر چیز کو برباد کر کے رکھ دیں۔ وہ سمجھتے ہیں ہم عالمِ فطرت پوری طرح

آگاہ ہیں لیکن یہ کی خام خیالی ہے۔ اسی لیے تو مدنی انھیں کہتے ہیں کہ بے سپر کھیتیوں کا کچھ تو خیال کرو۔ ایسا نہ ہو کہ جدید ایجادات کی یہ ہوا ایک تیز آندھی میں بدل جائے اور نمو کے تمام آثار کو روئے زمین سے مٹا دے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور تمام کائنات کو مسخر کرنے کا فن جانتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سائنس کی یہ دولت ایسی ایسی ایجادات و اختراعات ہو جائیں جو خود بنی نوع انسان کے لیے ہلاکت کا باعث بنیں۔ آخری شعر میں شاعر نے انسان کو ایک پودے سے تشبیہ دی ہے کہ آدمی ہی تو اس دنیائے کشت کا واحد پودا ہے۔ اگر یہ پودا ہی اپنا وجود کھو بیٹھے گا، اپنی ہی ایجادات کی وجہ سے اپنی ہستی کا نام و نشان مٹا ڈالے گا تو اس محنت و مشقت کا کیا فائدہ۔ انسان کی تمام ذہنی و جسمانی توانائیاں بے سود ہو کر رہ جائیں گی۔

نظم "غروب" سے اقتباس:

اے میرے دل ترا تول کب تک الگ
کوئلے کی سلوں میں رہے موج زن
میں بھی ہیرے کی رگ تو بھی ہیرے کی رگ
چند اعداد کے سرد اوزار سے
کاؤنٹر کی پری ایک ایڈنگ مشین
کاٹ سکتی ہے ہیرے کو اک وار سے
مرکزِ ثقل ہے دکاں خوش غلاف
نرخِ بازار کے دائروں میں ترا
پستیوں کی طرف ہی ملے گا گراف(۱۴)

نظم "کوئی شاخ آشنا" میں عزیز حامد مدنی نے شہروں میں فضائی آلودگی اور دھویں کی وجہ سے ہونے والی ماحولیاتی تبدیلی کو موضوع بنایا ہے۔ ذیل میں اشعار ملاحظہ کریں:

شہر پر نیلے دھویں کی سامری زنجیر ہے
جل رہا ہے سینۂ خورشید میں داغِ غروب
روشنی مجروح طائر کی طرح دلگیر ہے

خواب و بیداری کے تیرہ فاصلوں کے درمیاں
کتنے اندیشوں کی بے حلقہ جریبیں کھول کر
ناپتا ہے اس خلا کو ایک وقتِ رائگاں(۱۵)

اس نظم میں "شہر پر نیلے دھویں کی سامری زنجیر" سے مراد دھویں کی ایک دبیز تہ ہے جس کی وجہ سے سارا شہر ایک دھندلا نظارہ پیش کر رہا ہے۔ اس دھویں نے سورج کی شفاف روشنی اور تابانی کو شام کے دھندلکے میں بدل دیا ہے۔ سورج روشن ہونے کے باوجود داغ غروب اپنے دامن میں سجائے بیٹھا ہے۔ آفتاب کی کرنیں مدھم ہو چلی ہیں۔ اس آلودہ ماحول اور دھویں کی سیاہی نے روشنی کو ایک زخمی پرندے کی طرح سوگوار کر دیا ہے اور وہ مغموم و ملول انداز میں اس ماحول کو دیکھ رہا ہے۔

شاعر نے ان مصرعوں میں شہر کی آلودہ فضا کی عکس بندی انتہائی خوبصورت اور بلیغ انداز میں کی ہے۔ عزیز حامد مدنی کے ہاں ادراکِ حقیقت اور کرب کے احساس کی تمام جہتیں موجود ہیں۔ ماحولیاتی آلودگی ایک عالمی مسئلہ بن کر ابھر رہی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کی نسبت ترقی پذیر ممالک میں یہ مسئلہ شدت اختیار کر چکا ہے اور یہ ممالک ابھی تک اس پر قابو پانے سے قاصر ہیں۔ نظم "ائیر پورٹ کی رات" اقتباس دیکھیے:

پائلٹ کاریں نقیب آہن تازہ حرام
شہر کی چادر پر لرزاں ایک شورِ بے کراں
نیند کر دیتا ہے دو شیزہ زمینوں پر حرام

کچھ نہیں تو چادرِ گل میں چھپا کر لے چلیں
موم کے پر کے خدا کی میتِ بے نام کو
اس سوادِ تیز گامی سے اٹھا کر لے چلیں(۱۶)

ماحولیاتی آلودگی کی بہت سی وجوہات ہیں۔ جن میں زہریلی گیس اور دھواں خارج کرنے والی فیکٹریاں سر فہرست ہیں۔ اس کے علاوہ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کو آگ لگانے اور فصلوں کی باقیات کو جلانے سے دھوں پیدا ہوتا ہے۔ ہوائی جہازوں اور ٹرین کا شور بھی فضا کو آلودہ کرتا ہے۔ دھواں چھوڑنے والی گاڑیاں بھی ماحولیاتی آلودگی کا ایک اہم سبب ہے۔ پاکستان میں استعمال شدہ گاڑیوں کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ جب کوئی گاڑی زیادہ عرصے تک استعمال میں رہتی ہے تو اس کے انجن میں مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ گاڑیوں سے نیلا دھواں اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انجن آئل جلا رہا ہوتا

ہے۔ ناقص وینٹیلیشن کی وجہ سے نیلا دھواں اکثر و بیشتر گاڑی سٹارٹ ہوتے وقت نکلتا ہے، جو کہ آلودگی پیدا کرنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ امتیاز احمد ماحولیاتی آلودگی کے نقصانات کے بارے میں بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس ماحولیاتی آلودگی کے سبب پوری دنیا کے درجہ حرارت میں مجموعی طور پر ۰.۶ سنٹی میٹر تک اضافہ ہوا ہے جو کہ عالمی سطح پر بہت تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک عالمی سروے کے مطابق جہاں اس ماحولیاتی آلودگی کے سبب بیماریوں کی تعداد میں حیران کن حد تک اضافہ ہو رہا ہے وہاں ہر شہری اوسطاً اپنی مجموعی عمر کے تین سال بھی اس آلودگی کی وجہ سے کم کر رہا ہے۔[۱۷]

سائنسی ترقی کے اس عہد میں جدید ایجادات نے جہاں انسان کو بہت سے فوائد بہم پہنچائے ہیں، وہیں جدید ٹیکنالوجی کی وجہ سے بہت سے مسائل بھی سامنے آئے ہیں۔ آلودگی کی وجہ سے خالص پانی، خالص ہوا اور خالص غذا کا ملنا ممکن نہیں اور بے شمار بیماریاں جنم لے رہی ہیں۔ اسی دھویں والی فضا کی وجہ سے پاکستان کو "سموگ" کا سامنا ہے۔ جس سے پاکستانی شہری ایک نئی مصیبت سے دوچار ہو چکے ہیں۔ امتیاز احمد اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> پچھلے چند سالوں میں پاکستان میں ایک پانچواں موسم "سموگ" متعارف ہو چکا ہے جو ہر سال اکتوبر کے آخر میں یا نومبر کے آغاز میں سر اٹھاتا ہے۔ لاہور چوں کہ ایک بہت بڑا شہر ہے۔ لاہور کی سڑکوں پر ٹریفک کا ایک ہجوم نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ پورے لاہور میں جابجا گندگی کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔ ان وجوہات کی بنا پر لوگوں کو ایک نئی فوج کا سامنا ہے۔ جس کی وجہ سے کئی بیماریاں سر اٹھاتی ہیں۔ مثلاً آنکھوں کی جلن، گلے کی خرابی، نزلہ، فلو، زکام اور بخار وغیرہ۔[۱۸]

فضائی آلودگی کے باعث ماحول میں پیدا ہونے والی تبدیلی سے بے شمار بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ زمین کے گرد اوزون کی قدرتی تہ کو دھویں اور دیگر کثافتوں کی وجہ سے شدید خطرہ لاحق ہو چکا ہے۔ فضائی آلودگی سے موسموں میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زمین کا درجہ حرارت بڑھتا جا رہا ہے۔ فضائی آلودگی، صحتِ عامہ کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ بن چکی ہے۔ اگر اس کی روک تھام کے لیے مناسب اقدامات نہ کیے گئے تو اس کے اثرات سے آنے والی نسلوں کو بچانا مشکل ہو جائے گا۔

نظم "موسم کا تغیر" سے بند ملاحظہ کریں:

در پے تغیر ہے اک انقلابِ تیز گام
شیشۂ ساعت میں آوارہ بگولوں کا حرام
اک نئی مٹی سے گوندھے جا رہے ہیں، صبح و شام

اب رصد گاہوں کے پیمانوں سے لو دینے لگا
ایک موسم کا تغیر کروٹیں لینے لگا[۱۹]

عزیز حامد مدنی نے سائنسی ترقی کے مضر اثرات کو اپنی نظموں میں جابجا پیش کیا۔ مدنی کی سائنسی حسیت ان کی شاعری میں نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ ان کی لفظیات اور تراکیب فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ ہیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

دور تک اس فضا میں خواب و بیداری کی جنگ
شہر سے گزری ہے آوارہ ہوا ترکش بدوش
جانے کس سینے میں اترے آخرِ شب کا خدنگ

دور تاریکی کی چادر سے شرر اڑتے ہوئے
رات کے جنگل کا جادو ریلوے کی ورکشاپ
اک دھویں میں آہنی فیلوں کے دل مڑتے ہوئے[۲۰]

عزیز حامد مدنی نئے الفاظ اور نئی تراکیب تراشنے اور انھیں مہارت سے استعمال کرنے کے ہنر سے بہ خوبی واقف تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں سائنسی و ٹیکنالوجی کے اثرات کے ساتھ سامراجی خداؤں کی سازشوں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ وہ سائنسی ایجادات کے سائے بین الاقوامی سامراج کی شر انگیزیوں سے پردہ اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ سائنسی ایجادات نے نہ، صرف ہمارے ماحول اور، صحت کو نقصان پہنچایا ہے، بلکہ روحِ تہذیب پر بھی منفی اثرات ڈالے ہیں۔ مدنی ان تغیرات کی کوکھ سے جنم لینے والے ضرر رساں اور غیر مفید اثرات کو موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں ریلوے کے نظام کا آغاز انگریز دورِ حکومت میں ہوا۔ بہ ظاہر یہ نظام برصغیر کی عوام کی سہولت اور آسانی کے لیے بنایا گیا تھا، لیکن پس پردہ انگریز حکومت کے ذاتی مفادات اور لوٹ مار کا ذریعہ تھا۔ اس ریلوے لائن کے ذریعے ہندوستان کے قدرتی وسائلکوئلہ، لوہا، سیسہ، روئی اور منافع بخش چیزوں کو برطانیہ میں اپنی فیکٹریوں میں استعمال کرنے کے لیے بندر گاہوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ انگریز دورِ حکومت کے دوران جدید آلاتِ نقل و حمل کی ایجاد سے تہذیبِ مشرق کو بے پناہ نقصان اٹھانا پڑا، انگریزوں کی آمد سے مشرقی تہذیب کا حسن پارہ پارہ ہو گیا۔ ثقافت کی دھجیاں بکھر گئیں اور برصغیر کی عوام برطانوی نو آبادیات میں بدل گئی۔ حمید نسیم اس پس منظر کی وضاحت کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

آخری مغل بادشاہ کا ایک ہاتھی تھا۔۔۔۔انگریز، صاحب بہادر کی حکومت آئی اور ریلوے لائن بچھا دی گئی۔ بادشاہ کی معزولی کے بعد وہ ہاتھی شہر چھوڑ کر جنگل میں چلا گیا۔ بہت دنوں کی تنہائی سے اکتا کر یہ شاہی فیل شہر کی طرف نکل آیا اور اسی شان اور طمطراق سے گھومنے لگا۔ اب کیا ہوا، اس نے دھواں چھوڑتا ایک عفریت دھاڑتا چھک چھک کرتا اپنی طرف آتا دیکھا۔ بس اس کے پنکھوں جیسے کان کھڑے ہو گئے۔ ادھر سے وہ عفریت بڑھا اُدھر سے اس نے پہلا حملہ کیا، پہلی ہی ٹکر میں ادھ موا ہو گیا۔ رہی سہی سکت مجتمع کر کے اٹھنے ہی کو تھا کہ اس عفریت نے اسے پارہ پارہ لاش بنا دیا۔ (۲۱)

عزیز حامد مدنی جدیدیت اور روشن خیالی کے قائل ہیں لیکن وہ ایسی سائنسی ترقی اور ایجادات کے خلاف ہیں جو انسانی تہذیب و ثقافت اور اخلاقی اقدار کو ختم کر دیں۔ کیوں کہ نئی تہذیب انسان کو اپنی حقیقی روایات سے دُور کر رہی ہے۔ ہم اخلاقی طور پر تنزل کا شکار ہو چکے ہیں۔ خود سری اور بد اخلاقی آکاس بیل کی طرح پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ عزیز حامد مدنی کی شاعری مبہم ہوتے ہوئے بھی ابلاغ کی جھلکیاں دکھاتی ہے۔ مدنی عہدِ جدید کو علوم اور ایجادات کو ایک شش جہاتی جہاں قرار دیتے ہیں۔ یہاں انسانی ذہن کش مکش کا شکار ہے۔ سائنسی فکر سے مکمل کنارہ کشی بھی نہیں کی جا سکتی اور روایات کو پس پشت ڈال کر جدید تہذیب کی بالا دستی قائم کرنا بھی دانش مندی نہیں۔ نظم "موجِ نفس" کے اشعار ملاحظہ کریں:

کب سے ہے روئے زمیں پامال سا
کوئلے کا ڈھیر بے اشعال سا
یہ قفس، یہ خاک دانِ خاکیاں
صحنِ ویراں میں ہے شورِ ماکیاں
پھر سوادِ شرق ہے تاریک بن
دودھ کے پیالوں پہ ہیں سانپوں کے پھن (۲۲)

درج بالا اشعار میں برصغیر کی تاریخ و تہذیب کے زوال اور انگریز سامراج کی سائنسی ایجادات کے سائے میں دھوکہ دہی اور فریب کو بیان کیا گیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی سرزمین پر انگریزوں کی بالا دستی قائم ہو چکی تھی۔ تمام اقوام ذہنی پسپائی اور گہرے، صدموں کا شکار تھیں۔ احساسات و جذبات پر برف پڑ چکی تھی اور نئے خیالات اور جدید افکار سے رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ ایسے میں برصغیر کی تمام قومیں خصوصاً مسلمان شکست خوردگی کی حالت میں تھے۔ انگریزوں نے

سائنسی ایجادات اور افکارِ جدیدہ سے برصغیر کی تہذیب کو ناقص قرار دیتے ہوئے اپنی اجارہ داری قائم کر لی تھی۔ فہیم شناس قاسمی اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

> غدر کی جنگ میں برصغیر کی شکست دراصل ایک تہذیب کی دوسری تہذیب سے شکست تھی۔ پرانی اور فرسودہ دنیا پر ایک نئی تہذیب کی یلغار تھی انگریز اپنے ساتھ نئی سائنسی ایجادات اور منصوبے لے کر آئے تھے۔ ہندوستان کے باشندے اپنی شکست پر کبیدہ خاطر بھی تھے اور انگریزوں کے سازوسامان پر متحیر بھی، ان کے دل بری طرح کانپ رہے تھے مگر ہونی کب رکتی ہے۔ زمانہ کبھی نہیں ٹھہرتا اور نہ ہی تنقید اور تخلیق دونوں کا سفر رکتا ہے، اگر دونوں رسوم اور قیود کے پابند ہو بھی جائیں تو ایک بھونچال آجائے جو کسی بھی ہیبت ناک اور سکوت آمیز لمحات میں اچانک تاریخ اور تہذیب کی بنیادیں ہلا دیتا ہے۔ ایسے قیامت خیز لمحات میں پورے سکون کے ساتھ ٹھہر کر مکمل ہوش و حواس کے ساتھ حالات اور اپنے فرائض کا جائزہ لینا ہر دانشور پر فرض ہے۔ اسے اپنی تاریخ اور تہذیب سے رجوع کرنا چاہیے۔[۲۳]

عزیز حامد مدنی کے تفکر اور دانش مندی کا ثبوت ہے کہ وہ سائنس اور معاشیات کے اثرات کے ساتھ انگریز سامراج کی سازشوں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں مشرقی تہذیب کے زوال اور ان کی وجوہات کا ذکر بار ہا

ملتا ہے۔ نظم "حفظِ کشت" کے اشعار ملاحظہ کریں:

اس فضا میں بھی ہے فساد ابھی
روندتا کھیتیوں کو گزرے گا
ایک انبوہ شہر نژاد ابھی
دشت اور در کی فضائیں کہتی ہیں
غولِ خنزیر کھیتیوں کی طرف
بڑھ رہا ہے ہوائیں کہتی ہیں[۲۴]

مدنی دورِ جدید کو علوم اور ایجادات کا شش جہاتی جہاں قرار دیتے ہیں۔ یہاں انسانی ذہن کش مکش کا شکار ہے اور کسی ایک جانب رُخ کر کے چلنے سے گھبرا رہا ہے۔ مدنی کہتے ہیں سائنس و ٹیکنالوجی سے مکمل کنارہ کشی بھی اختیار نہیں کی جا سکتی اور تہذیبی روایات کو پس پشت ڈال کر جدید تہذیب کی بالادستی قائم کرنا بھی دانش مندی نہیں۔ لہٰذا اپنی سمت کا

درست تعین کرنا ضروری ہے تا کہ اس دورِ تغیر کے تمام زاویوں سے آشنائی حاصل کی جاسکے۔ عزیز حامد مدنی "دانشِ حاضر کے سواد میں" میں لکھتے ہیں:

> اس، صدی کے ادب کو ایک نہایت آسیب زدہ سائبان بسر کرنے کو ملا ہے۔ اس سائبان کے نیچے سائنس بھی ہے، ٹیکنالوجی بھی ہے، دنیا کی آفتیں بھی ہیں، دلوں کے درد بھی ہیں۔ تاریخ و تغیر کے اس عظیم سواد سے گھر کی طرف لوٹیے بھی تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے جدید ادب کی روح بہت آشفتہ حال ہے۔ مجروح پرندے کی سی آواز آتی ہے، جو دھویں میں گھر گیا ہے۔ سکون کے دو حرف، کوئی آہستہ خرام لے کے کوئی خواب اور آہنگ اس میں نہیں ملتا۔ ظاہر و باطن میں جدید فکر ایک سیلِ بے کراں ہے۔ اس سیل میں سیاسی، نفسیاتی، علامتی، غیر علامتی بلا خیز موجوں کا دیوانہ پن ہے۔ (۲۵)

بیسویں، صدی جدید فکر اور ایجاداتِ نو کی، صدی کہاتی ہے۔ اس دور کے تغیرات نے زندگی کے تمام زاویوں کو تیزی سے بدلا ہے۔ معاشرے کا فکری و سماجی ڈھانچہ ایک نئے پیکر میں ڈھلنے لگا۔ عہدِ نو کی جدید فکر کے مطابق تشکیل پانے لگا اور اس کا اظہار شعری فکر میں نمایاں ہو کر سامنے آیا۔ عزیز حامد مدنی کی نظم "کاکلِ وقت" میں زمانے کے انہی بدلے ہوئے اطوار اور معاشروں کی تبدیلی کو بیان کیا گیا ہے۔ سائنسی علوم نے مختلف شعبہ ہائے زندگی میں جو نمایاں ترقی کی ہے اور انسانیت کی فلاح کے لیے جو اقدامات اٹھائے ہیں اس کا ذکر نظم "کاکلِ وقت" میں نو عمر مرد کی آواز میں کچھ یوں ظاہر ہوتا ہے:

قحط و امراض سے
خستگی سے جہالت سے اس دور کے مرد و زن
مستقل جنگ کرتے رہے ہیں
ان کی ایجاد
ان کے علوم
ان کا فن
نو بہ نو قافلے جستجو کے۔۔۔۔۔ گزرتے رہے ہیں
وقت کی لوح پر نقش در نقش ابھرتے رہے ہیں
سائنس داں، ڈاکٹر
نقش گر، ماہرانِ نباتات، بہنائے انجم
شاعر و مطرب و فلسفی

ہر نفس زیست کو پیار سے نرمیوں سے
جگاتے رہے ہیں[۲۶]

عزیز حامد مدنی جہاں سائنسی ایجادات کے ضرر رساں پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں، وہیں اس کے فوائدِ کثیر کا ذکر بھی کرتے ہیں۔

سائنسی فکر اور علوم جدیدہ کی بدولت انسان اس مقام تک پہنچ چکا ہے جہاں جدید ایجادات کے زیرِ سایہ سائنس دان، ڈاکٹر، نقش گر، ماہرانِ نباتات، علمِ نجوم کے ماہر، شاعر اور فلسفی بنی نوع انسان کے لیے منعفت بخش سامانِ حیات مہیا کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ ان تمام شعبوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین نے علم و جستجو کے وسیع سمندروں میں غوطہ زن ہو کر ہر نفس زیست کو سنوارنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔

عزیز حامد مدنی کا کمالِ فن ہے وہ شعری فکر کا اظہار مخصوص انداز اور منفرد اسلوب کے ذریعے کرتے ہیں۔ انھوں نے انسان کی آزادی، فکر و خیال کو وقت کی ضرورت قرار دیا ہے۔ وہ جدید علوم کو انسانیت کی فلاح اور کامیابی کے لیے اہم سمجھتے ہیں۔ سرور جاوید لکھتے ہیں کہ:

> نظم "کاکل وقت" کمزور نسوانیت اور طاقت ور مرد کے درمیان مکالمے کی، صورت میں دورِ جدید میں تعقل اور تفکر کی عظمت انکشاف اور اس کے منفی اثرات کی فصاحت کرتے ہوئے سائنسی فکر کی حمایت کا شعری اظہار ہے جو کسی اور شاعر جدید کے ہاں نظر نہیں آتی۔[۲۷]

عزیز حامد مدنی عالمی منظر نامے پر گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ ان کی سیاسی، سماجی اور سائنسی بصیرت کا اعجاز ہے۔ وہ مشرق و مغرب کے مزاج اور تہذیب کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔ وہ انسانی تاریخ اور عالمی ادب کا عمیق مطالعہ رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں نظم "سارقوں کی کشتیاں" سے اقتباس ملاحظہ کریں:

یہ سمندر، یہ ہوا کا نم، یہ خوابیدہ فضا
روحِ قزاقان عالم کا ہے ساحل سے خطاب
سارقوں کی کشتیوں پر تیرگی ہے اک نقاب
دور تک ان جہاز اور ان کے رُخ پر جھائیاں
جزرومد میں بیرق قندیل کی پرچھائیاں
رہ گزار وقت پر ہیں حادثوں کی کھائیاں
رات کی دیوار وقتِ بے مروت کا ہدف

دیو دیدہ چشم ساحل خوابِ وحشت کا ہدف [۲۸]

یہ نظم عالمی سامراجیت اور سائنسی ایجادات کے معاشرے، تہذیب اور ثقافت پر منفی اثرات کو موضوع بناتی ہے۔ عزیز حامد مدنی نے اس نظم میں عالمی سامراج کی شر انگیزیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بنیادی طور پر سامراجیت کسی ملک کی سرحد پار کر کے اس کے اختیارات میں دخل اندازی کرتا ہے۔ اس نظام میں کسی ملک کو سیاسی، اقتصادی، جغرافیائی اور مالیاتی طور پر قبضے میں لے کر وہاں کے باشندوں کو حقوق سے محروم کرنا ہے۔

اردو کے نظریہ دان، نقاد اور محقق سہیل احمد سامراجیت (Imperialism) کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> سامراج کی اصطلاح دوسری جنگِ عظیم کے بعد "نو آبادیات" کے نام سے جانی گئی۔ نو آبادیات ایک ایسا سفاک اور استبدادی رویہ ہوتا ہے جس میں ایک طاقت ور ملک چھوٹے اور کمزور علاقوں پر اپنا تسلط قائم کرتا ہے اور ان کا سیاسی، معاشرتی، ثقافتی استحصال کیا جاتا ہے اور فوجی قوت اور سازشوں سے مقامی اداروں اور ثقافت کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ یہ مقامی زیرِ تسلط خطے کو "سونے کی چڑیا" تصور کرتے ہیں۔ ایک ملک سرحدوں سے باہر جا کر دوسرے ملک کے اختیارات پر دخل اندازی کرنے کے عمل کو سامراجیت کہتے ہیں۔ یہ دخل اندازی جغرافیائی، سیاسی یا اقتصادی طور پر ہو سکتی ہے۔ [۲۹]

یہ سامراجی خدا نہ، صرف زمینی وسائل اور اختیارات پر قبضہ کرتے ہیں بلکہ اس خطے کے ساحلی علاقوں اور سمندر پر بھی اپنی تسلط قائم کر کے ناجائز طریقوں سے مال لوٹتے ہیں۔ بحری قزاق تیل اور گیس سے بھرے جہازوں اور مال سے

لدی ہوئی بڑی کشتیوں کو نشانہ بناتے ہیں اور تمام مال کو قبضے میں لے لیتے ہیں۔

عزیز حامد مدنی نے درج بالا نظم میں الفاظ و تراکیب کو بہت عمدگی سے پیش کیا ہے جو ان کی عصری حسیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انھوں نے مشرق و مغرب کے مسائل اور تضاد کو شعوری سطح پر بیان کیا ہے۔ مغرب کی جانب سے مشرقی ممالک کے استحصال اور حقوق کی پامالی کے احساس نے مدنی کو کرب ناک اذیت سے دوچار کیا ہے جس کا اظہار ان کی مختلف نظموں میں نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔

نظم "سارقوں کی کشتیاں" کے حوالے سے جاوید سرور رقم طراز ہیں کہ:

> مدنی کی نظم "سارقوں کی کشتیاں" عہد جدید میں سائنسی اور معاشیات کی نئی سائنس کے اثرات کے ساتھ سامراجی خداؤں کی سازشوں کی طرف اشارہ بھی ہے۔ یہ بھی مدنی کے تفکر اور تعقل کا ایک رخ ہے کہ وہ سائنسی ایجادات

کے سائے میں بین الاقوامی سامراج کی ریشہ دوانیوں کی نشاندہی بھی کرتے ہیں اور مشرقی تہذیب پر بلکہ مجموعی طور پر روحِ تہذیب پر نئے تغیرات کے منفی اثرات کو بھی اپنا موضوعِ سخن بناتے ہیں۔[۳۰]

نظم "کش مکش" میں بیسویں، صدی کے جدید معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے۔ اشعار دیکھیے:

بجروں میں گامزن ہے اک طرف خود روحِ وصل
عہدِ نو بھی کچھ عجب بہم و رجا کا دور ہے
اک طرف خود کیمیا ہے قاطع بنیادِ نسل

نازکی ایسی کے دل کا آئنہ ہے پاش پاش
خاک کے ذروں سے سیاروں کی نیلی آگ تک
جستجو ایسی کہ وجہِ زندگی کی ہے تلاش[۳۱]

جب معاشرے قدرتی ماحول کو اس کی گنجائش سے زیادہ اپنی خواہش کے مطابق بے دریغ استعمال کرتے ہیں اور قدرت کے عطا کردہ تحفوں کی قدر نہیں کرتے تو زوال ان کا مقدر بن جاتا ہے۔ یہ زوال انسانی جانوں کے ساتھ تہذیبی عناصر کو بھی روند ڈالتا ہے۔ عزیز حامد مدنی نے عہد نو کے عجائب اور جدید ٹیکنالوجی کو انسانیت اور ماحول دوست معاشرے کے لیے جان لیوا قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ، صنعتوں کے قیام اور سائنسی ایجادات سے ہم معاشی طور پر تو مضبوط ہو رہے ہیں لیکن ٹیکنالوجی کا حد درجہ استعمال ہمارے لیے ایسے خطرات پیدا کر رہا ہے جو ہمیں تباہی کی طرف لے جانے کا پیش خیمہ ثابت ہو رہے ہیں۔

اگر بہ نظرِ غائر ماحول کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ماحولیاتی آلودگی کا تعلق محض ہوا، پانی اور مٹی تک محدود

نہیں بلکہ اس کی اور بھی اقسام ہیں جو انسانی، صحت کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرتی، سیاسی، سماجی اور اخلاقی سطح پر انسانی کردار کی تباہی کا باعث بن رہی ہے۔ تازہ تحقیقات میں سامنے آیا ہے کہ آلودگی کا تعلق براہِ راست فیصلہ کرنے کی، صلاحیت میں کمزوری، ذہنی، صحت کے مسائل، سکولوں میں بری کارکردگی اور جرائم سے ہے۔

حیاتِ انسانی کی بقا کے لیے صاف پانی انتہائی ضروری ہے۔ پینے کے لیے، صاف پانی میسر نہ ہونے کی وجہ سے بے شمار بیماریاں جنم لیتی ہیں جس طرح انسانوں کے لیے، صاف پانی ناگزیر ہے اسی طرح زمین کی زرخیزی اور اس میں اگنے والی فصلوں کو بھی، صاف پانی مہیا کرنا ہمارے فرائض میں شامل ہے لیکن آلودگی اور، صنعتوں کے قیام کے باعث فصلوں اور

زرخیز زمینوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے بعد کیمیائی ادویات ایجاد ہوئیں۔ فصلوں پر کیڑے مار ادویات کا استعمال کر کے زرعی پیداوار میں اضافہ کیا جاتا ہے لیکن ان کے زیادہ استعمال سے زمین کی زرخیزی میں کمی واقع ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ زمین بنجر ہو جاتی ہے۔

محمد ریاض ماحولیاتی آلودگی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> جدید ٹیکنالوجی کی بدولت نئے نئے کارخانے اور، صنعتی ادارے قائم ہو رہے ہیں۔ ان، صنعتی اداروں میں استعمال ہونے والے ایندھن کی وجہ سے ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی مقدار میں اضافہ ہو رہا ہے اور فاضل مادوں کا اخراج طبعی ماحول کو خراب کر رہا ہے۔ اس طرح سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے بعد کیمیاوی ادویات ایجاد ہوئیں جس سے زیادہ پیداوار کا حصول ممکن ہو گیا لیکن ان ادویات کے استعمال کی وجہ سے زمین میں مضر اثرات بھی پیدا ہوئے۔ نتیجتاً ان زہریلی ادویات کا اثر انسانی جسم پر نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔ زراعت کے استعمال میں ہونے والی کیڑے مار ادویات پانی کو آلودہ کرنے کا باعث بنتی ہیں۔ ان فصلوں سے حاصل کی جانے والی غذا انسانی جسم میں داخل ہو جاتی ہے تو یہ دھاتی اجزاء معدے، جگر اور گردوں کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں۔ (۳۲)

اس ترقی یافتہ اور سائنٹیفک دور میں انسان ہر نفس آسمان کی بلندیوں کو سر کرنے میں مصروف عمل ہے۔ جدید سے جدید کی خواہش نے انسان کو مادیت کے گہرے کنویں میں پھینک دیا ہے جہاں اخلاقی اقدار کو بنجر خیالات نے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ عہدِ نو امید و نا امید کی غلام گردش میں محوِ رقصاں ہے۔ سائنسی تجربات اور کیمیائی عوامل کی بدولت جہاں انسان کو سہولتیں اور فوائد ملتے ہیں وہیں یہ کیمیائی ادویات انسانی، صحت کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہیں اور نسلِ انسانی کی ہلاکتوں کا باعث بنتی ہیں۔ نظم "کش مکش" کا بند ہے:

آدمی بربط نوازِ امن عالم ہے کہیں
اک پیالے میں سمو لیتا ہے یہ تریاق و زہر
غیر کیسا اپنے سایے سے بھی برہم ہے کہیں

آئن سٹائن کی، صدی، ذراتِ نو ترتیب کی
مہر میں اک خوابِ گل اک طائرِ ابر بہار
قہر میں خود یہ، صدی سے شعلۂ تاریب کی (۳۳)

عزیز حامد مدنی نے بیسویں صدی کو آئن سٹائن کی صدی قرار دیا ہے۔ آئن سٹائن کو اس، صدی کا سب سے بڑا سائنس دان سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے پوری زندگی کائنات کو سمجھنے اور اس کے رازوں سے واقفیت حاصل کرنے میں صرف کر دی۔ طبیعیاتی سائنس کی بنیاد آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت پر قائم ہے۔ انھوں نے توانائی اور مادے کے تعلق کی وضاحت کی، ایٹم کو توڑ کر توانائی حاصل کرنے کا نظریہ پیش کیا اور کہا کہ کائنات کی کوئی چیز روشنی کی رفتار تک نہیں پہنچ سکتی۔

عزیز حامد مدنی "دانشِ حاضر کے سواد میں" رقم طراز ہیں کہ:

> توانائی کا بہاؤ کسی یکساں مد و جزر کی کیفیت سے نہیں ہوتا بلکہ وہ ذرات جوہر سے فواروں کے دھاروں کی طرح اچھل پڑتی ہے۔ جوہر ہماری، صدی کا نوزائیدہ بچہ بال ہٹ لے کر پیدا ہوا ہے جو خود کو ماہر طبیعیات کے قابو میں نہیں آرہا۔ اب تو ایک ذرہ جوہر میں پورا نظام شمسی بسا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مختلف ماہرینِ طبیعیات کے انکشاف نے جہاں فطرت کے رازوں کو ٹٹولا ہے وہاں معاشرے کے لیے کچھ الجھنیں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ آئن سٹائن پیڈ اور پنسل لے کر مساوات کے معصوم ٹکڑے لکھ گیا۔ مگر وہ خود بھی اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ اس کی تحقیقی فکر سے دنیا میں کیا کیا عظیم تغیر ہونے والا ہے۔ کتابت میں یہ مساوات کہ الف=ب ج$E=MC^{2}$ کس قدر آسان ہے مگر اس کی عملی، صورت ہیروشیما کی تباہی کا باعث ہوئی۔ (۴۴)

نئی صدی انسان کو جدید علوم اور وسیع افراد سے روشناس کراتی ہے جو اس کو سکون آمیز سہولیات فراہم کرنے کے ساتھ کرجاوادیت اور اضطرابی کیفیت سے دوچار کرتی ہے۔ سائنس، ٹیکنالوجی کے اس دورِ تغیر میں دنیاوی آفتیں بھی ہیں اور عالمی سامراج کی سازشیں بھی۔ طرزِ جنگ و جدل بھی ہے اور مشینوں کی حکومت بھی۔ ٹیکنالوجی سے ملنے والی تفریحات بھی ہیں اور اخلاقی گراوٹ کے نقشے بھی، کرب آلودہ تنفس بھی ہے اور دلوں کے درد بھی۔

الغرض!

بیسویں، صدی وہ سیلِ بیکراں ہے جس کی لہروں سے تہذیبی اقدار، امن و آتشی، بنیادی تصورات اور کائناتی حقائق میں انقلاب برپا ہو گیا ہے۔ معاشرے کے قدیم اصول رد کر کے نئے اور پیچیدہ فکری رویوں کو رائج کیا گیا ہے۔ سیاسی و سماجی رجحانات کے بدلاؤ نے پورے سماجی نظام کا رُخ مخالف سمت میں موڑ دیا ہے، یہ انسانی عقل پرستی اور سائنس و ٹیکنالوجی پر حد درجہ انحصار کا نتیجہ ہے۔

نظم "روحِ عصر" میں جدید معاشرے کے رجحانات اور تہذیبی زندگی کے تغیرات کو سائنسی آلات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ اشعار دیکھیے۔

یہ تیری مملکت ترا دربار
یہ مشینیں یہ گیس یہ اوزار

گھومتی تکلیاں سلگتے تنور
گیت گاتے ہوئے جواں مزدور

سائنس کے خواب ناک گپت بھون
آتشِ نو کے جگمگاتے لگن[35]

عزیز حامد مدنی نے اس نظم میں سائنس اور صنعت کی ترقی کو واضح کیا ہے۔ جیسے جیسے معاشرہ میکانکی انداز اختیار کر رہا ہے۔ علوم و فنون کی مہارتیں زوال پذیر ہوتی جا رہی ہیں۔ انسانی معاشرہ سائنسی قوت کے سامنے بے بس ہو گیا ہے۔ اس مشینی دورِ حکومت میں انسان رفتہ رفتہ مشین کا ایک پرزہ بنتا جا رہا ہے۔ انسانوں کی نسبت جدید آلات، مشینوں اور اوزاروں کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ مادہ پرستی کے تصور نے فرد کے وجود سے بیگانگی اختیار کر لی ہے۔ مادی ترقی کی دوڑ میں انسان احساس اور جذبے کی دولت سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ صنعتی معاشرہ انسانی فلاح کے لیے سامانِ زیست تو مہیا کرتا ہے لیکن وجود کی خلا اور ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر دکھائی دیتا ہے۔

شمیم حنفی جدیدیت اور نئی شاعری میں لکھتے ہیں کہ:

> سائنس انھی ضرورتوں اور مقاصد پر دھیان دیتی ہے جس کا اظہار حیاتیاتی اور مادی سطح پر ہوتا ہے۔ وجود کی نادیدہ ضرورتوں اور ناشنیدہ، صدائیں اس کے ہوش و گوش تک نہیں پہنچتیں۔ وہ جب انسان کے مادی مقاصد کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو ٹیکنالوجی کو جنم دیتی ہے۔ لیکن آلات سوچ نہیں سکتے اور نہ محسوس کر سکتے ہیں۔ وہ جب اپنی توانائیوں کو دریافت کرتی ہے تو انسان کو سمندروں کی سطح اور خلا کی بلندیوں تک لے جاتی ہے۔ لیکن فرد کے سینے کا سمندر اور روح کا خلا اس کی رسائی سے دور ہوتا ہے۔ وہ فن کی طرف قدم بڑھاتی ہے تو معماروں اور سنگ تراشوں اور کاریگروں اور تکنیکی ماہروں کی ایک فوج اکٹھا کر دیتی ہے۔ لیکن فن کے لیے یہ ارزانی اور وسائل کی یہ فراوانی سامانِ ہلاکت بھی بن جاتی ہے۔[۳۶]

موجودہ دور میں سرمایہ دارانہ نظام قائم ہے۔ اس مشینی عہد میں کارخانوں کے مالک بڑی بڑی مشینوں کو چلانے کے لیے مزدوروں کو معمولی اجرت پر ملازمت دیتے ہیں۔ انھیں زندہ انسانوں سے زیادہ مشینوں کی فکر ہوتی ہے۔ یہی

مزدور ان مشینوں کی حفاظت کرتے ہیں کیوں کہ ان کی روزی روٹی کا انحصار انھی پر ہوتا ہے۔ کارخانوں کی بھٹیوں میں جلتے ہوئے، فولادی مشین کے نیچے آکر ہاتھوں اور پاؤں سے معذور ہوتے ہوئے، مالک کے سفاک رویوں کو سہتے ہوئے یہ مزدور انھی مشینوں کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں لیکن مزدور طبقے کے حالات نہیں بدلتے۔ نظم "کاکلِ وقت" میں، صنعتی ترقی کے مسائل کی نشاندہی کچھ یوں کرتے ہیں:

دورِ صنعت کا افسوں
دُور تک وہ مشینوں کی آنکھیں
سرخ و بیدار آنکھیں
سینہ ارض میں جھانکنے والے اوزار
صنعتی ماہی گیروں کے پھینکے ہوئے جال
زندگی کے سمندر سے بے نام اشیا کو کرتے رہے ہیں شکار
صرف محنت کشوں کے کڑے بازوؤں کی، صلابت سے ہے یہ بہار
آبروشیوۂ کوہ کن کی یہی ہے
کاٹ کر جوئے شیر اِک اسی نے نکالی
ملوں کے دھڑکتے ہوئے بے دستوں سے (۳۷)

عزیز حامد مدنی کی گہری بصیرت صنعتی معاشرے کے نقائص اور سامانِ ہلاکت کی فراوانی کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتی ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ ترقی یافتہ انسان نے مشینوں کے دھوئیں سے روحِ انسانی کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ سائنس کے خواب ناک ماحول میں حقیقت کی تلخیاں چھپ نہیں سکتی۔ کیوں کہ سائنسی تہذیب میں جلنے والے قمقموں کی مصنوعی روشنی انسانی آنکھوں کو زیادہ دیر تک خیرہ نہیں کر سکتی۔

شمیم حنفی لکھتے ہیں کہ:

> مشینوں کی حکومت انسانی طرزِ عمل کی ایک ایسی صورت پیش کرتی ہے جس میں خود انسان کی حیثیت ایک انتہائی حساس مشین سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ سائنس کی ترقی جسمانی صحت میں اضافہ کرتی ہے اور بیماریوں کے مقابلے کے لیے وسیع تر وسائل فراہم کرتی ہے۔ لیکن انسانی صحت کے وہ سرچشمے جن کا اظہار جبلتوں اور جذبات پر ہوتا ہے، بے اعتنائی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ (۳۸)

جب مشینی دور کا آغاز ہوا تو معاشرے پر سرمایہ داروں کی بالادستی قائم ہو گئی۔ منافع کے حصول کی خاطر مشینوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جانے لگا۔ محنت کا بدترین استحصال شروع ہو گیا اور بے روزگاری میں اضافہ ہونے لگا۔ روزگار کے حصول کے لیے لوگ شہروں میں مقیم ہو گئے۔ شہری آبادی میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ شہروں میں کارخانوں اور ملوں کے قیام سے زرعی رقبہ سکڑ رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادیوں سے جغرافیائی صورت حال، جنگلات، آبی ذخائر اور ماحول تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے۔، صنعتوں میں بسے ہوئے شہر، دھویں سے چلنے والی گاڑیاں اور نقل و حمل کے جدید ذرائع توانائی کے نئے وسائل کی ظاہری شکلیں ہیں جو انسانیت کی بقا کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔

نظم "روحِ عصر" سے اقتباس دیکھیے:

پٹریاں ریل کی، ملوں کے چاک
ذرہے جس کے قدم سے شہر کی خاک

یہ زمیں کے بدن کی جوت، یہ آگ
سر سے پا تک رچا ہوا اک راگ

صنعتوں سے بسے ہوئے مہ و سال
مشک سے پر ہے جیسے نافِ غزال[۳۹]

عزیز حامد مدنی، صنعتی معاشرے اور بڑے شہروں کی گھٹن زدہ زندگی کی خستہ حالی کو فصاحت و بلاغت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ مدنی کی یہ نظم عصری تہذیب اور صنعتی ترقی کے پر پیچ راستوں کی تصویر کشی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے تمام اشعار میں گہرے احساس اور کرب ناک اذیت کی کیفیت ملتی ہے کیوں کہ اس مادی ترقی نے انسان کے قلب و
ذہن اور تہذیب کا نقشہ یکسر بدل دیا ہے۔

نظم "اک طلوع شب ہے قندیلوں سے" اپنی، صدی کے تغیرات اور مصنوعی پن کا واضح اظہار ہے۔ اشعار ملاحظہ کریں:

یہ صدی عہدِ سیاست کا ہے ایسا چیستاں
ردوکد کے سخت ہنگاموں سے کٹتی ہے زباں

اک طرف صاحب نظر بارود کے موجد بھی ہیں
ہند کے اجزا قدیم و نو کے محوِ ضد بھی ہیں

یہ،صدی راڈارو سگنل کی فضاؤں کا ہے دور
بحر اوقیانوس کے تازہ خداؤں کا ہے دور(۴۰)

بیسویں صدی میں پوری دنیا سیاسی، سماجی اور سائنسی انقلابات کی زد میں تھی۔ اٹلی، روس، جرمنی اور یورپ میں سیاسی حوالوں سے معنی خیز تبدیلیاں آرہی تھیں۔ اسلامی ممالک ایران اور عراق پر یورپی اقوام تسلط جمانے کی کوششوں میں تھیں۔ برصغیر کے مسلمانوں میں برطانوی اقتدار کے اثرات کے نتیجے میں جارحانہ رویہ پیدا ہو چکا تھا۔ اس جذبے کے اظہار کی پاداش میں بہت سے مسلمان رہنماؤں کو قید و بند کی، صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اس سیاسی منظر نامے اور سماجی تغیرات نے نئے علوم اور نئے ادب کی تخلیق کے لیے بنیادیں فراہم کیں۔

اپنے مضمون "بیسویں، صدی کا سیاسی، سماجی ماحول اور جدید اردو غزل" میں اختر شاد لکھتے ہیں کہ:

> یہ وہ زمانہ تھا جب دنیا کے بڑے ممالک، صنعتی دور میں داخل ہو رہے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں نئی سائنسی ایجادات سامنے آئیں۔ سامراجی طاقتوں کی جنگ توسیع ممالک کی بجائے کاروباری مسابقت کی بنیاد پر ہونے لگی۔ نو آبادیاتی ریاستوں میں بڑی طاقتیں کاروباری تعلقات کی آڑ میں اپنا سیاسی اثر ورسوخ بڑھانے لگیں۔ دوسری طرف ملوکیت اور سامراجیت کے خلاف احتجاج ہونے لگا اور تقسیم دولت کے بارے میں بالشویک مفکروں کے نظریات طبقاتی شعور کو بیدار کرنے لگے۔(۴۱)

بیسویں صدی کی ہنگامہ خیزیوں اور حشر سامانیوں نے عالمی اور انفرادی سطح پر ایسے اثرات مرتب کیے جس نے اخلاق اور انسانیت جیسے جذبوں کو مٹا کر طاقت اور سامراجیت کا رواج قائم کیا۔ خوف اور دہشت کی قوتوں نے تمام عالم پر قبضہ کر لیا۔ جوہری آلات کے شعوری استعمال نے انسانی بستیوں کو ایٹمی راکھ میں تبدیل کر دیا۔

عزیز حامد مدنی نے بارود کی ایجاد اور جنگوں میں اس کے استعمال کو بیان کیا ہے۔ بارود کی ایجاد کا سہرا چینیوں کے سر باندھا جاتا ہے۔ انھوں نے بارودی مواد کو کبھی جنگی مقاصد اور تباہی کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ وہ سماجی تقریبات میں

اسے آتش بازی کے لیے استعمال کرتے تھے۔ چینیوں کو چار مشہور ایجادات کا موجد مانا جاتا ہے جن میں گن پاؤڈر، بارود، قطب نما، کاغذ اور پرنٹنگ شامل ہے۔ گن پاؤڈر یورپ میں مختلف ایجادات میں استعمال کیا جانے لگا۔ اس کا سب سے زیادہ ضرر رساں استعمال جوہری ٹیکنالوجی کی، صورت میں سامنے آیا۔ یورپی اقوام نے جنگ میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں میں بارود کا استعمال بڑھا دیا۔

بارودی عہد کے بارے میں غلام جیلانی خان اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں کہ:

> بارودی عہد کی ابتدا کے بعد دنیا کی ساری افواج کے تین حصے بڑے اہم شمار ہوتے تھے۔ پہلا حصہ "رسالہ" کہلاتا تھا جو گھڑ سواروں پر مشتمل ہوتا تھا۔ دوسرا "پیادہ" جو پیدل سپاہ سے عبارت تھا اور تیسرا "توپخانہ" تھا جو میدانِ جنگ سے بہت پیچھے آپریٹ کرتا تھا۔ اس توپخانے کا وہ حصہ جو چھوٹی توپوں (Cammons) اور مارٹرز (Mortars) پر مشتمل ہوتا تھا۔ وہ پیادہ سپاہ کے ہم رکاب ہوتا تھا۔ بڑی بڑی توپوں کو گھوڑوں اور بیلوں سے کھینچ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جاتا تھا۔ ان توپوں کو قلعوں کی فصیل توڑنے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اس لیے اس کا نام "حصار شکن توپخانہ" (Seige Artillery) بھی تھا۔ گھوڑوں کو میدانِ جنگ سے اوڈلف ہٹلر نے نکالا۔ اس نے اپنی فوج میں گھوڑے اور گھڑ سواروں کی بجائے ٹینک شامل کیے۔ (۴۲)

دوسری عالمی جنگ میں ٹینکوں اور جدید ہتھیاروں کے استعمال سے اَن گنت انسانی جانوں کا زیاں ہوا۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگ بے گھر ہوئے۔ جوہری تابکاری اور شعاعوں نے شہروں کو راکھ میں بدل دیا۔ عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے۔ جنگی، صورت حال کے بعد ملکوں میں قحط پیدا ہو جاتا ہے اور صدیوں تک پسماندگی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق عالمی جنگوں میں تقریباً نو کروڑ کی آبادی، صفحۂ ہستی سے مٹ گئی تھی۔ نظم "آبادی کے دائرے" کے بند ملاحظہ کیجیے:

ٹینک سے دبتے ہوئے بیجوں میں فصلیں بے سبیل
رحم میں تاریخ افلاس جہاں لب پر سوال
خشک سالی، خشک سالی سے زمیں کے رُخ پہ نیل

وقت بے تقویم کے ذوق جنوں کے رازدان
سر بریدہ جراتیں روندی ہوئی لاشوں کے غم
زندگی کی دوڑ میں یک نیزہ خوں کے رازداں (۴۳)

دنیا کے کئی اہم سائنس دان اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی جہاں ایک طرف دنیا میں تبدیلی لا رہی ہے وہیں انسانیت کی ہلاکتوں کا سامان بھی مہیا کر رہی ہے۔ ایکسپریس نیوز کے مطابق:

> برطانیہ کے اس، صدی کے اہم ترین سائنس دان اسٹیفن ہاکنگ کا کہنا ہے کہ جوہری جنگ، عالمی درجہ حرارت میں اضافہ اور خود تخلیق کردہ وائرس انسانی بقا کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ جب کہ سائنس و ٹیکنالوجی میں ترقی کچھ ایسے نئے راستے کھول رہی ہے جو کسی بھی وقت غلط راستے پر جا سکتے ہیں۔ (۴۴)

الغرض عزیز حامد مدنی کی نظمیں سائنسی نظریات اور جدید اقدار سے مالا مال ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جدت اور روایت کے بندھن کو قائم رکھا۔ جدید سائنسی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں میں ہمیں روایتی تشبیہات، استعارے اور علامتیں بھی جابجا نظر آتی ہیں۔

عزیز حامد مدنی کی سائنسی حسیت اور جدید شاعری سے ان کی ہمہ گیری اور وسعتِ نظری کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے جدید علوم اور نظریات کے تحت اردو نظم کو نئی جہتوں سے روشناس کروایا۔ مدنی کا کمال فکر یہ ہے کہ وہ روایت اور جدت کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ وہ روایتی افکار سے مکمل انحراف نہیں کرتے اور علوم جدیدہ سے بھی مستفید ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں جدید سائنسی نظریات کے حامی شاعر، ادیب اور سائنس دانوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ جن میں شیکسپیئر، ملٹن، کارل مارکس، لینن، فرائڈ، فلیمنگ، پکاسو، سر چارلس چپلن، پروفیسر ٹائن بی، برٹرینڈ رسل، نیوٹن اور آئن سٹائن کے نام شامل ہیں۔

عزیز حامد مدنی نے دنیا میں ہونے والے انقلابات کی وجہ سے سیاسی، سماجی، نظریاتی اور ادبی کشمکش کو اپنی نظموں کا حصہ بنایا ہے۔ انھوں نے سائنس دانوں کے افکار و نظریات اور انکشافات و ایجادات سے اردو شاعری کو وسعت اور کشادگی عطا کی ہے۔ اسی خوبی کی بدولت ان کی شاعری عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔

سائنس و ٹیکنالوجی کا پیچیدہ نظام انسان کو فطرت کی رنگینیوں سے دور کرتا ہے۔ اس مادہ پرستی کے دور نے انسان سے ذاتی، صفات اور اخلاقی اقدار چھین لی ہیں۔ عزیز حامد مدنی ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں جہاں سائنسی افکار تہذیبی اور اسے مل کر ایک متوازن ماحول تشکیل دیں۔ وہ ایک ایسا فلسفہ حیات چاہتے ہیں جو سائنسی ترقی کے ساتھ اخلاقی، روحانی اور آبرومندانہ زندگی کا ضامن ہو۔

حوالہ جات

۱۔ ظفر سعید سیفی، "اب ہم ہیں اور ماتم یک شہر آرزو" مشمولہ کلیاتِ عزیز حامد مدنی، مرتبہ، ظفر سعید سیفی (کراچیاکادمی بازیافت، ۱۹۱۳ء)، ص ۱۲۔

۲۔ شمیم حنفی، جدیدیت اور نئی شاعری (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء)، ص ۸۰۔

۳۔ ایضاً، ص ۸۱۔

۴۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ، کلیاتِ عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۶۵۔

۵۔ کلیات عزیز حامد مدنی، مشمولہ "دانشِ حاضر کے سواد میں"، عزیز حامد مدنی، (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۳۷۔

۶۔ حمید نسیم، پانچ جدید شاعر (فضلی سنز، ۱۹۹۴ء، ص ۲۷۳۔

۷۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ، کلیاتِ عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۶۶۔

۸۔ ایضاً، ص ۲۰۳۔

۹۔ ظفر سعید سیفی، "اب ہم ہیں اور ماتم یک شہر آرزو" مشمولہ کلیاتِ عزیز حامد مدنی، مرتبہ، ظفر سعید سیفی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۱۹۱۳ء)، ص ۱۲۔

۱۰۔ جنگوں اور جنگی تیاریوں کے ماحول پر اثرات، http://amp.wd.com، ۱۱:۱۰، ۵ مئی ۲۰۲۱ء۔

۱۱۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ، کلیاتِ عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۰۳۔

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۰۷۔

۱۳۔ سماجی شعور اور سائنسی ترقی، www.ibcurdu.com، ۳:۲۰، ۳ مارچ ۲۰۲۱ء۔

۱۴۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ، کلیاتِ عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۱۲، ۲۱۳۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۲۶۱۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۹۶، ۲۹۸۔

۱۷۔ ماحولیاتی آلودگی، www.urdunotes.com، ۴:۲۴، ۱۰ مئی ۲۰۲۱ء۔

۱۸۔ ایضاً۔

۱۹۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ، کلیاتِ عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۱۵۔

۲۰۔ ایضاً، ص ۲۶۲۔

۲۱۔ حمید نسیم، پانچ جدید شاعر (فضلی سنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۳۱۴۔

۲۲۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ،کلیاتِ عزیز حامد مدنی(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص۳۳۱۔

۲۳۔ عزیز حامد مدنی اور سائنٹیفک شعور،www.facebook.com:۵۰۰،۱۳مارچ ۲۰۲۰ء۔

۲۴۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ،کلیاتِ عزیز حامد مدنی(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص۲۰۶۔

۲۵۔ کلیاتِ عزیز حامد مدنی مشمولہ "دانشِ حاضر کے سواد میں "عزیز حامد مدنی(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص۱۳۳۔

۲۶۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ،کلیاتِ عزیز حامد مدنی(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص۴۵۹۔

۲۷۔ سرور جاوید، "عزیز حامد مدنی۔۔۔طرزِ مرصع کا نیا اسلوب" مشمولہ اردو نظم کی عظیم روایت(کراچی:رنگِ ادب پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء)،ص۳۱۴۔

۲۸۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ،کلیاتِ عزیز حامد مدنی(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص۵۱۴۔

۲۹۔ آزاد دائرۃ المعارف www.wikipedia.com, ۱۲:۰۰،۴مئی ۲۰۲۱ء۔

۳۰۔ سرور جاوید، "عزیز حامد مدنی۔۔۔طرزِ مرصع کا نیا اسلوب" مشمولہ اردو نظم کی عظیم روایت(کراچی:رنگِ ادب پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء)،ص۳۱۱۔

۳۱۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ،کلیاتِ عزیز حامد مدنی(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص۵۱۷،۵۱۸۔

۳۲۔ محمد ریاض علیمی، "ماحولیاتی آلودگی اور ہماری ذمہ داریاں سیرت النبیؐ کی روشنی میں" روزنامہ نوائے وقت،۱۴نومبر ۲۰۲۰ء۔

۳۳۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ،کلیاتِ عزیز حامد مدنی (کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص۵۱۸۔

۳۴۔ کلیاتِ عزیز حامد مدنی مشمولہ "دانشِ حاضر کے سواد میں "عزیز حامد مدنی(کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص۱۳۷۔

۳۵۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ،کلیاتِ عزیز حامد مدنی (کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص۵۳۰۔

۳۶۔ شمیم حنفی،جدیدیت اور نئی شاعری(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص۲۱۱۔

۳۷۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ،کلیاتِ عزیز حامد مدنی (کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص۴۴۸۔

۳۸۔ شمیم حنفی،جدیدیت اور نئی شاعری(لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۸ء)،ص۲۱۴۔

۳۹۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ،کلیاتِ عزیز حامد مدنی (کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص۵۳۰۔

۴۰۔ ایضاً،ص۵۹۶۔

۴۱۔ بیسوی، صدی کا سیاسی، سماجی ماحول اور جدید اردو غزل،www.punjnud.com۷مئی ۲۰۲۱ء۔

۴۲۔ جو عالمِ ایجاد میں ہے صاحبِ ایجاد،http://dailypakistan.com.pk/columnist

43۔ ظفر سعید سیفی، مرتبہ،کلیاتِ عزیز حامد مدنی (کراچی:اکادمی بازیافت،۲۰۱۳ء)،ص۵۳۰۔

44۔ سائنسی ترقی انسانی حیات کے خاتمے کا سبب بن سکتی ہے www.expess.com:۳:۵۰،۱۸جون ۲۰۲۱ء۔

باب چہارم:

عزیز حامد مدنی کی نظم میں سائنسی اصطلاحات

باب چہارم:

عزیز حامد مدنی کی نظم میں سائنسی اصطلاحات

اصطلاح:

وہ لفظ جو کسی شعبہ علم میں کچھ خاص اور جداگانہ معنی کے ساتھ رائج ہو، اصطلاح کہلاتا ہے۔ اصطلاح کے مغوی معنی باہم مصلحت کر کے کچھ معنی مقرر کر لینے کے ہیں۔ اسی طرح وہ الفاظ جن کے معنی بعض علوم کے لیے مخصوص کر لیے جائیں، اصطلاح علوم میں داخل ہیں۔ اصطلاحی اور لغوی معنی میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوتا ہے۔

حصولِ علم اور فروغِ علم میں اصطلاحات کی اہمیت ہر لحاظ سے مسلّم ہے۔ کسی بھی علمی بات کی وضاحت و تشریح کے لیے عام زبان میں طویل فقروں اور بے شمار جملوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ لیکن علمی زبان میں اصطلاح کا صرف ایک لفظ معنی پورا کر دیتا ہے۔ علامہ سید الحق اصطلاح کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اصطلاح میں ایک گروہ کا متفق ہو کر کسی لفظ کے معنی موضوع کے علاوہ اور معنی مقرر کر لینا کہ ہم اپنی قوم کیا صطلاح میں اس سے یہ مراد لیں گے اس میں وجہ اور غیر وجہ کی قید نہیں۔ (۱)

اصطلاحات عموماً وہی الفاظ ہوتے ہیں جو روز مرہ معمولاتِ زندگی میں ادا کیے جاتے ہیں۔ تاہم کسی مخصوص علمی یا تکنیکی میدان کے ماہر لوگ اس کے معنی کچھ مختلف طے کر لیتے ہیں تاکہ نئے الفاظ بنانے کی ضرورت نہ پڑے۔ مثال کے طور پر عوام وزن سے مراد مادے کی مقدار لیتے ہیں۔ اہلِ عروض کے ہاں وزن ایک اصطلاح ہے جس کے معنی حرکات و سکنات کی ترتیب اور تکرار کے ہیں۔ ماہرینِ طبیعیات کے ہاں یہی اصطلاح اس قوت کا مفہوم رکھتی ہے جس سے زمین مادے کو اپنی جانب کھینچتی ہے۔ گویا یہ مختصر بیانی کا ایک طریقہ ہے جو علوم و فنون کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مد نظر ناگزیر ہو گیا ہے۔ عہدِ حاضر کی وسیع تحقیقاتی، علمی اور فنی دنیا میں اصطلاحوں کے بغیر کسی علم کا بیان ممکن نہیں۔ اصطلاحیں در اصل ایسے بلیغ اشارے ہوتے ہیں جو خیالات کے مجموعے کی طرف ذہن کو منتقل کر کے اصل معانی کی تصویر سامنے لے آتے ہیں۔

سائنسی اصطلاحات:

دیگر شعبہ ہائے علوم کی طرح ہر سائنسی علم کی بھی کچھ اپنی مخصوص بنیادی اصطلاحات ہوتی ہیں۔ اصطلاحات کو

درست فہم وادراک حاصل کیے بغیر اس علم میں مہارت حاصل کرنا ممکن نہیں۔ سائنسی اصطلاحات کے مروج ہونے کے بارے میں تصنیف سائنسی اصطلاحات اور ان کا پس منظر میں کچھ یوں بتایا گیا ہے:

> آج سائنس کی بیشتر مروجہ اصطلاحات زیادہ تر لاطینی اور یونانی زبان کے الفاظ سے آئی ہیں۔ کیوں کہ اس میدان میں رومیوں اور یونانیوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، وہ لائقِ ستائش ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی صدیوں تک علمی و سائنسی مضامین کی ادائیگی کے لیے انہی زبانوں کا سہارا لیا جاتا رہا۔ تاہم سائنس کی بہت سی اصطلاحات نے دیگر زبانوں جیسے جرمن، روسی، عربی، قدیم انگریزی، چینی، سنسکرت اور فرانسیسی سے بھی جنم لیا۔[۲]

اردو کے تمام بڑے شعرا کے ہاں سائنسی اصطلاحات پائی جاتی ہیں۔ غالبؔ اور اقبالؔ کے ہاں سائنسی شعور کی جلوہ گری جابجا اپنے رنگ بکھیرتی نظر آتی ہے۔ دورِ جدید میں اقبالؔ کے بعد آنے والے شعرا میں بھی سائنسی تصورات نمایاں دیکھے جاسکتے ہیں۔ جس میں ن۔م۔ راشد، نذیر احمد شیخ، مجید امجد اور احمد ندیم قاسمی سر فہرست ہیں۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں سائنس فکشن کے لیے بے شمار اشعار پڑھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے علاوہ عزیز حامد مدنی، جمیل الدین عالی، شہزاد احمد، امین خیال، جواز جعفری، کاشف نعمانی اور غلام حسین ساجد کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

عزیز حامد مدنی کی نظم میں سائنسی اصطلاحات:

اردو شاعری نے ہر عہد کے فکری، ذہنی، تہذیبی اور جذباتی تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ ہر زمانے کے فلسفیانہ حقائق اردو شاعری کی زینت بنتے رہے۔ ادب چوں کہ زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس لیے عہد بہ عہد شاعری زندگی اور زندگی سے جڑے تمام مسائل اور بنیادی خیالات سے ہم آہنگ رہی ہے۔ جدید نظم نگاروں میں عزیز حامد مدنی نے جدید تہذیب کے عناصر کو منفرد اسلوب اور جامع انداز کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے جدید طرز معاشرت اور سائنس و ٹیکنالوجی سے ہونے والی تبدیلیوں کو تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جابجا سائنسی تصورات اور سائنسی اصطلاحات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان کی شاعری میں بڑے شہر کی زندگی اور اس کا تضاد واضح ہے۔ اس کا اظہار انھوں نے مختلف تشبیہات اور علامتوں کے ذریعے کیا ہے۔ مدنی کی نظم میں لفظوں کا انتخاب تو نہیں بدلتا لیکن مفاہیم کی ایک نئی لغت سامنے آتی ہے۔ انھوں نے اپنی لفظیات اور اسلوب کے ذریعے سائنسی فکر کی نشاندہی کی ہے۔ مدنی کے اسلوب کے بارے میں مبین مرزا کچھ اس انداز میں لکھتے ہیں:

> عزیز حامد مدنی کے اسلوبِ سخن کا کمال یہ ہے کہ وہ اس عہد کے تجریدی، تخریبی اور لایعنی اور کھردرے انسانی تجربات کو بھی تخلیقی جمالیات سے ہم کنار کرتے ہوئے ابلاغ کی سطح پر لانے میں پوری طرح کامیاب رہتا ہے۔ اس

پورے عمل میں اس کی زبان اسی طرح حیران کن اور فکر افروز کردار ادا کرتی ہوئی نظر آتی ہے جیسی "ویسٹ لینڈ" میں الیٹ کی یا پھر "یونی سسز" میں جوئس کی۔ (۳)

ذیل میں مدنی کی نظموں میں موجود سائنسی اصطلاحات پر روشنی ڈالی جائے گی۔ عزیز حامد مدنی کا پہلا شعری مجموعہ چشمِ نگراں ہے۔ اس کی پہلی اشاعت مارچ ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ اس مجموعے کی نظم "آخری تجویز" میں سائنسی اصطلاحات واضح طور پر دکھائی دیتی ہیں:

یہ شبِ تار یہ محرابصد آثارِ کہن
آہ یہ کژدم و خفّاش کا پُرخول وطن
فہم و ادراک سے چھٹتے نہیں بے جان گہن
نالۂ بوم میں سینوں کی دھڑک گم ہے ابھی
اک سیاہی میں ستاروں کی چمک گم ہے ابھی (۴)

ہمارے نظامِ شمسی میں سورج ایک ستارہ ہے۔ ستارے کی روشنی اس کے اندر مختلف گیسوں کے جلنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ستارے کی سطح زمین نہیں ہوتی بلکہ وہ گیسوں کا گولا ہوتا ہے۔ طاہر القادری اپنی کتاب اسلام اور جدید سائنس میں ستاروں کی حوالے سے لکھتے ہیں:

درمیانے درجے کے ایک ستارے کی زندگی چند ارب سال کے قریب ہوتی ہے یہ عام طور پر ہائیڈروجن سے بنے ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ہائیڈروجن جل کر ہیلیم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہائیڈروجن سے ہیلیم میں تبدیلی کے عمل کے ساتھ ساتھ ہیلیم بھی شدید درجہ حرارت کی بنا پر جلنے لگتی ہے اور ہائیڈروجن اور ہیلیم کے جلنے کا یہ دوہرا عمل ستارے کو اور بھی زیادہ گرم کر دیتا ہے۔ ہیلیم کی راکھ (یعنی کاربن) ستارے کے مرکز میں جمع ہوتی جاتی ہے تو ستارا اچانک ایک دھماکے سے پھول جاتا ہے اور اپنی اصلی جسامت سے کئی گنا بڑھ جاتا ہے اور اس کا رنگ بھی سرخ ہو جاتا ہے۔ (۵)

ہماری کائنات بے شمار ستاروں اور سیاروں سے بھری ہوئی ہے۔ زمین ایک سیارہ ہے جو سورج نامی ستارے کے گرد محوِ گردش ہے۔ ستاروں کی اپنی روشنی ہوتی ہے لیکن سیارے ستاروں سے روشنی حاصل کر کے چمکتے ہیں۔ یہ قانونِ قدرت ہے جو اتنے بڑے کائناتی نظام کو بلا تعطل متحرک رکھے ہوئے ہے۔

نظم "موسم کا تغیر" میں سائنسی اصطلاح رصد گاہ کا استعمال کیا گیا ہے۔ نظم کا آخری بند دیکھیے:

فضائیں دشمنِ جاں ہیں ہوا حریفانہ
مزاج دانِ تغیر رہا ہے برسوں سے
یہ میرے فن کا فسردہ ملول ویرانہ
سمندر کا مدو جزر دشت و در کا غبار
قلم سے الجھے ہوئے،صد ہزار تشنہ سوال
رم و سکون و طلوع و غروب کی پیکار
حدیثِ دل سے ہوئی کس جتن سی،صرف نہ پوچھ
سمو رہی ہے ابھی نیک و بد کے ہنگامے
کن آئنوں میں رصد گاہِ،صوت و حرف نہ پوچھ(۶)

اردو سائنس بورڈ نے رصد گاہ کی تعریف کچھ اس انداز میں بیان کی ہے:

ایسا عمارتی ڈھانچہ جس میں فلکی اجسام اور مظاہر کا مشاہدہ کرنے کے لیے دور بین اور دیگر آلات موجود ہوں "رصد گاہ" کہلاتی ہے۔ رصد گاہی آلات میں دور بین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جدید فلکیات میں فلکی اجسام کے مشاہدے اور ان کی فوٹو گرافی کے ساتھ آسمانوں سے آتی روشنی کا طیف نمائی تجزیہ بھی معلومات کا اہم ذریعہ ہے۔ اس طرح کے تجزیے میں کسی ستارے سے آتی روشنی کو مختلف طول موجوں میں بانٹ کر ان کا الگ الگ تجزیہ بھی کیا جاتا ہے۔ یوں ستارے کے درجۂ حرارت اور کیمیائی اجزائے ترکیبی کے متعلق اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔(۷)

مدنی کی یہ نظم ایک وجدانی کیفیت سے معمور نظر آتی ہے یہاں سائنسی اصطلاح کا استعمال اک نئے زاویے سے کیا گیا ہے۔ نظم میں رصد گاہ سے مراد فلکی اجسام کے مشاہدے، ستاروں سے آنے والی روشنی کے حوالے سے معلومات کے حصول اور ڈیٹا کو محفوظ کرنے والے آلات کی جگہ نہیں بلکہ یہ "رصد گاہِ، صوت و حرف" ہے، جہاں حروف، الفاظ اور آوازوں کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ گزرے ہوئے لمحوں کی آہٹیں اور آنے والے وقت کا حال بیان کیا جاتا ہے۔

عزیز حامد مدنی کی نظم "رصد گاہ" کے حوالے سے حمید نسیم رقم طراز ہیں:

یہ وجدان کی رصد گاہ ہے۔ اس کے چپ اور بے حرکت دروازوں اور سقف و بام پر فضا نے حرف لکھے ہیں۔ شاعر وقت کے کنایوں کو سمجھنے لگا ہے، اس نے دیکھ لیا ہے کہ ہوا کا قلم ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ حرف لکھ رہا ہے۔ سو بات جشن کی، ساعتِ سعید کی، رقص و نغمہ کی نہیں ہو سکتی۔(۸)

عزیز حامد مدنی کہتے ہیں بدلتے ہوئے ماہ و سال اور جدید تہذیب نے ہمارے ماحول اور اقدار پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ طلوع و غروب کی پیکار نے دل کی دنیا میں ایک حشر برپا کر دیا ہے۔ نہ جانے اگلا لمحہ کون سا در وا کرے اور دنیا کا نقشہ بدل جائے، نیک و بد کے ہنگامے کس طرف اپنا رُخ کر لیں اور حرف و صوت کی رصد گاہ نہ جانے کن آئنوں میں ان نا مساعد حالات کو محفوظ کر لے۔

نظم "انجم شناس سے" میں بھی سائنسی اصطلاحات نظر آتی ہیں، جیسے:

ایک مسکن کہ جہاں غم کا نشاں بھی نہ ملے
ایک مدت سے مگر نیم عیاں بھی نہ ملے
وہ ستارے جو شراروں پہ ہنسا کرتے تھے
کرب آلودہ تنفس کے سوا
اور جو کچھ ہے وہ قانون کی زنجیر کا ماتم ہی تو ہے(۹)

لفظ "تنفس" کی وضاحت ملاحظہ کریں:

سانس لینے کے عمل میں ہمارے پھیپھڑے باہر سے ہوا اندر کھینچتے ہیں۔ خلیوں اور ٹشوز کو خوراک کو قابل ہضم بنانے کے لیے آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس عمل میں آکسیجن خرچ ہوتی ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا ہوتی ہے۔ ہمارے پھیپھڑے جب سکڑتے ہیں تو وہ اصل میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کو خارج کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمارے جسم کو ایک منٹ میں 250 ملی لیٹر آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھیپھڑے بڑے لچک دار ہوتے ہیں۔ یہ ہوائی نالیوں، ایلویالی، خون کی نالیوں اور لچک دار ٹشوز پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ہوا ایلویالی کے ذریعے اندر داخل ہوتی ہے پھر اس میں آکسیجن خون کی نالیوں میں چلی جاتی ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ ایلویالی کے ذریعے باہر نکل جاتی ہے۔ (۱۰)

مدنی نے اپنی اس نظم میں سائنسی الفاظ کا استعمال اس خوبصورتی سے کیا ہے جس سے ان کی شاعری کی ندرت اور سائنسی فکر اُجاگر ہوتی ہے۔ اس میں عملِ تنفس کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے اور معاشرتی جبر، لا قانونیت اور عصر حاضر کے پابہ زنجیر انسان کی مشکلات اور مصائب کو بھی سامنے لاتا ہے۔ کرب آلودہ تنفس کی ترکیب انسان کے اندرونی خلفشار اور اذیت کو بیان کرتی ہے۔ شاعر کہتا ہے تکلیف اس قدر زیادہ ہے کہ اس ماحول میں سانس لینا بھی محال ہے۔ مدنی کی ایک خوبصورت نظم "سمندر" ملاحظہ فرمائیں۔ اس میں بھی سائنسی تصورات پائے جاتے ہیں:

قلزمِ نیلگوں تیرے گرداب
رقص فرمائیں، تیز تر ہو جائیں
اک ذرا اور بے خبر ہو جائیں
جزر و مد کے ہزار ہوں عنواں(۱۱)

یوں تو مدو جزر کا تعلق چاند کی کشش کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب چودھویں کا چاند پوری آب و تاب سے چمکتا ہے تو اس وقت چاند زمین کے سامنے ہوتا ہے جس کی وجہ سے زمین کا پانی چاند کی طرف رُخ موڑ لیتا ہے لیکن زمین کی کشش اسے دوبارہ زمین کی طرف لے آتی ہے۔ جس سے سمندر کی لہروں میں اتار چڑھاؤ بنتے ہیں ان کو مدو جزر کہا جاتا ہے۔ اردو سائنس بورڈ نے مدو جزر کی اس طرح وضاحت کی ہے:

سمندر اور پانی کے دیگر بڑے ذخائر میں سطح آب کا یکے بعد دیگرے اور باقاعدہ اتار چڑھاؤ مدو جزر کہلاتا ہے۔ ان تغیرات کی وجہ زمین پر لگنے والی چاند اور کسی حد تک سورج کی تجاذبی کشش ہے۔ زیادہ عمومی انداز میں یوں کہا جائے گا کہ جب ہلکے اجسام ایک دوسرے پر تجاذبی کشش لگاتے ہیں تو ان کی اشکال مکمل کروی نہیں رہتیں۔ ان کی اشکال میں یہ تبدیلی جوار بھاٹا کہلاتی ہے۔ اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ جوار بھاٹا کرۂ ارض پر سمندروں سے اٹھنے والی ممکنہ طویل ترین موج ہے جو پورے کرۂ ارض کو اپنے گھیرے میں لیے ہوتی ہے۔ جبجوار بھاٹے کو اس طرح دیکھا جاتا ہے تو اس کا حوالہ بھاٹے کی لہر کے طور پر دیا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح بعض اوقات پانی کے نیچے آنے والے زلزلے کی پیدا کردہ شاک ویو کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ ابہام سے بچنے کے مؤخر الذکر کو اس کے جاپانی نام سونامی (Tsunami) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔(۱۲)

نظم "کاکلِ وقت" میں بے شمار سائنسی اصطلاحات پائی جاتی ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

ذرے ذرے میں اک روح بیدار
پردہ نشیں لیلیٰ سوگوار
آدمی کے لیے خاک بر سر ہے
کتنیصدیوں سے بے خط و خال اس
کی پرچھائیں اوٹ سے کوہساروں کی
روحِ آدم کو آواز دیتی رہی ہیں
تیرہ و تار عریاں سلگتے ہوئے خام ذرات کے جامد و بے حواس
عرض میں قید

جوہروں کے سفینوں کو کھیتی رہی ہے
ذرّے ذرّے میں اک روح بیدار پردہ نشیں لیلیٰ سو گوار (۱۳)

نظم کے ان مصرعوں میں زمیں روح بیدار سے مراد ایٹمز کے درمیان طاقت کا عنصر نیوکلیس ہے۔ اردو سائنس بورڈ نے اس کو یوں رقم کیا ہے:

الیکٹرانز نیوکلیس کے گرد مختلف مداروں میں گردش کرتے ہیں۔ نیوکلیس سے دور ہٹتے ہوئے مداروں کی تعداد میں الیکٹرانز کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ہر مدار میں الیکٹرانز کی ایک زیادہ سے زیادہ تعداد موجود ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پہلے مدار میں ۲ دوسرے میں ۸ اور تیسرے مدار میں ۱۸ الیکٹرانز موجود ہو سکتے ہیں۔۔۔ الیکٹران اور نیوکلیس کے درمیان موجود برقی مقناطیسی قوت فوٹانز کی وساطت سے عمل پیدا ہوتی ہے۔ جب کہ پروٹان اور نیوٹران کو باہم مجتمع رکھنے والی طاقت ور نیوکلیائی قوت گلیو آنز (Gulons) کی وساطت سے کام کرتی ہے یہ ایٹمی تشکیل ایٹم کا سٹینڈرڈ ماڈل کہلاتی ہے۔ (۱۴)

اسی نظم کا ایک اور اقتباس دیکھیے:

اس زمانے کی باتیں سنو
ایجاد کی ایک پنسلین ہی دیکھو
جسم کی کشتیاں تہہ نشیں تھیں کبھی موت کی لہر میں
کتنے امراض کے نیلگوں زہر میں
کتنے زخموں کا سنگین درد اس سے دھلتا رہا تھا
کتنے امراض کا قفل توڑا ہے
زخم سے دردِ جامد نچوڑا ہے
آخرش ان طبیبوں کی محنت، محبت کو دیکھو
یہ صدی کیمیا گر کے آلات کی چھاؤں میں
نلکیوں کے سبک صاف پردوں میں
آج بھی کتنی دوشیزہ اشیا کے اجسام کے مس سے بے تاب ہے (۱۵)

نظم میں پنسلین کی سائنسی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس کا موجد فلیمنگ ہے۔ انگریز طبیب الیگزینڈر فلیمنگ تجربہ گاہ میں کسی بیماری کے جراثیموں کی پرورش کر رہا تھا۔ تجربے کے دوران ڈبل روٹی کی پھپھوندی کے بزرے (spores) گرے اور پھپھوندی نے اپنے گرد ایک دائرہ بنالیا جس میں بیکٹریا موجود نہیں تھے جب کہ باقی جگہ پر

جراثیم اسی طرح تھے۔ چناں چہ اس نے نتیجہ نکالا کہ اس پھپھوندی میں کوئی ایسا کیمیائی مادہ موجود ہے جو ان جراثیموں کو ختم کر دیتا ہے اور ان کی نشوونما رُک جاتی ہے۔ اس پھپھوندی کا سائنسی نام پینسلیم نوٹیٹم (Penicillum Notatum) ہے۔ اسی نسبت سے اس کیمیائی مادے کا نام پنسلین (penicillin) رکھا گیا۔ اسی کارنامے پر ۱۹۴۵ء میں فلیمنگ کو نوبل انعام دیا گیا۔ اردو سائنس بورڈ نے پنسلین کی تعریف کچھ یوں کی ہے:

> بیٹا لیکٹم (beta lectom) اینٹی بایوٹک (Antibiotic) ادویات کا ایک ایسا گروہ ہے جو بیکٹیریا سے لاحق ہونے والے متعدی امراض کے علاج میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس گروہ کے ارکان پینسلینک ایسڈ بنیادی ساختی حلقے پر مشتمل ہوتے ہیں۔[۱۶]

نظم "کاکلِ وقت" میں مدنی نے جدید زمانے کے بدلے ہوئے انداز کو موضوع بنایا ہے۔ سائنس دانوں نے انسانیت کی فلاح اور بھلائی کے لیے بے شمار چیزیں ایجاد کیں۔ قدیم زمانے میں انسان مختلف امراض کا شکار ہو کر موت کی وادیوں میں چلے جاتے تھے۔ وہ جتنی دیر اس بیماری میں زندہ رہتے اذیت ان کی رگ رگ میں سمائی رہتی۔ جب جدید علاج کے طریقے دریافت نہیں ہوئے تھے تب انسانی جسم سے فاسد مادوں کے اخراج کے لیے اذیت ناک طریقے اپنائے جاتے تھے۔ لیکن مختلف ادویات اور جرّاحی کے طریقوں نے انسان کو بیماریوں کے نیلگوں زہر سے آزاد کیا۔ امراض کا قفل توڑا اور زخموں سے ہونے والی دردناک اذیت سے انسان کو چھٹکارہ دلایا۔

نظم کے اسی بند میں ایک اور اصطلاح "کیمیا گری" کو نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔

کیمیا گری کی وضاحت اردو سائنس بورڈ انسائیکلوپیڈیا میں کچھ اس طرح کی گئی ہے:

> الکیمیا (Al-Chemy) یا کیمیا گری کیمیا کی ابتدائی شکل تھی۔ اس میں سائنس، جادوگری، فلسفے اور مذہب کو یکجا کر دیا گیا تھا۔ کیمیا گروں کی کوشش ہوتی تھی کہ مختلف چیزوں کو ملا کر سونا بنا لیا جائے۔ انہی لوگوں کی یہ کوشش بھی تھی کہ لوگوں کو لمبی اور صحت مند یا پھر نہ ختم ہونے والی زندگی عطا کرنے والی کوئی شے بنالیں۔ یہ اپنے ان مقاصد میں تو کامیاب نہ ہو سکے البتہ انھوں نے چیزوں میں کیمیائی تبدیلیاں لانے کے بہت سے طریقے وضع کر لیے۔۔۔۔ کیمیا گری کا زیادہ کام مصر کے شہر اسکندریہ (Alexandria) میں ہوا۔ جس کا کتب خانہ بہت مشہور تھا۔ ۶۴۲ء عیسوی میں جب عربوں نے مصر فتح کر لیا تو کیمیا گری سارے عرب میں پھیل گئی۔ عرب دانوں نے نظریہ پیش کیا کہ گندھک اور پارے کو مختلف مقداروں میں ملا کر مختلف دھاتیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔، صدیوں تک کئی ممالک میں اس نظریے کو پذیرائی حاصل رہی۔ تیرھویں صدی میں ایک برطانوی فلسفی اور کیمیا گر روجر بیکن (Roger Bacon) نے کیمیائی تحقیق کی بنیاد ڈالی۔[۱۷]

نظم "سفینہ" کے اشعار ملاحظہ کریں۔ اس میں بھی سائنسی تصورات کی نمایاں جھلک نظر آتی ہے:

ہوا نے، ابر نے، موجوں نے اس کو گھیر لیا
کئی غنیموں کی فوجوں نے اس کو گھیر لیا
خدائے بحر نے غصے میں جال ڈال دیا
نحیفِ جاں کے ترشول پر اچھال دیا
اِدھر پہاڑ سی موجیں تھیں اور ہوا کا جنوں
اُدھر ہے زور پہ کچھ اس کے ناخدا کا جنوں
اندھیری شب میں کوئی خط راہ داں رہ جائے
ستارے ماند نہ ہوں اور بادباں رہ جائے(۱۸)

سائنسی ترقی کی بدولت زمینی، فلکیاتی اور فضائی اشیا کے فہم ادراک کے تحقیقاتی ادارے قائم کیے جا چکے ہیں۔ اسی طرح ہوا کی لہروں کے لیے بھی ایک الگ تحقیقی ادارہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کو انگریزی میں (Metrologist) کہا جاتا ہے۔ اردو سائنس بورڈ انسائیکلوپیڈیا میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

موسمیات سائنس کی ایک شاخ ہے جس میں زمین کے کرۂ ہوائی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ موسم کا تجزیہ اور اس کی پیش گوئی کا تعلق اس مضمون کے عملی اطلاقات سے ہے۔ بالائی کرۂ ہوائی کا طبیعیاتی مطالعہ اس علم کی ایک شاخ ہے، جسے ایرونومی (Aeronomy) کہا جاتا ہے۔ سطح ارض کے اثر سے آزاد ہوا کا مطالعہ، ایرولوجی (Aerology) کہلاتا ہے۔ کرۂ ہوائی میں ہونے والی حرکات کا مطالعہ حرکیاتی موسمیات (Dynmic Meteorology) کہلاتا ہے۔ کرہ ہوائی کی طبیعیاتی خصوصیات کا مطالعہ طبیعی موسمیات (Physical Meteorology) میں کیا جاتا ہے۔ ان موضوعات پر قدیم ترین رسالہ ۳۴۰ قبل مسیح میں ارسطو نے Meteorologica کے نام سے لکھا۔ اس کے اخذ کردہ زیادہ تر نتائج اور مباحث جدید علم کی روشنی میں غلط ہیں۔ اس کے باوجود یہ تقریباً ۲۰۰۰ سال تک عالموں کو متاثر کرتے رہے۔ بطلیموس اور ارسطو کے نظریات کے اطلاق سے موسمیاتی پیش گوئیوں کی کوشش قدیم زمانے سے جاری ہے۔(۱۹)

نظم "ہیرے کا ورق" میں سیاروں کی گردش کا ذکر کیا گیا ہے۔ سیارے سورج کے گرد گردش کرتے ہیں، اس کو نظامِ شمسی (Solar System) کہا جاتا ہے۔ اردو سائنس انسائیکلوپیڈیا میں اس نظام کے متعلق یوں لکھا گیا ہے:

سورج اور اس کی کششِ ثقل میں بندھے سیارے، شہابیے، سیارچے، دم دار ستاروں اور سیاروں سے اچانک مل کر نظامِ شمسی بناتے ہیں۔ اس نظام کا سب سے بھاری جسم سورج ہے۔ نظامِ شمسی کی کمیت کا ۹۹۹ حصہ سورج میں مرتکز ہے۔ باقی ماندہ کمیت کا زیادہ تر حصہ ۸ بڑے سیاروں کے حصے میں آتا ہے۔ دیگر کمیت سیارچوں، شہابیوں، دم دار ستاروں اور سیاروں کے چاندوں کی ہے۔(۲۰)

نظم "تعارف" میں موجِ خوں کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس سے مراد نظامِ دورانِ خون ہے جس کے ذریعے
پورے جسم میں خون کی رسائی ممکن ہو پاتی ہے۔ شاعر نے بہت خوبصورت اور رومانوی انداز میں سائنسی تصور کو بیان کیا ہے۔ نظم سے اقتباس دیکھیے:

آئنہ گاہِ محبت میں تھا پرتو جس کا
اس کی تقدیر رہی بجھتی ہوئی شمعوں کا لگن
موجِ خوں دل سے اٹھی، صورتِ آئنہ جاں
اس کا چہرہ تھا کہ اک چاند پہ بکھرے گیسو
اک خطِ دید پہ ٹھہرہ تھی ابد ساز کرن(۲۱)

اردو سائنس انسائیکلوپیڈیا میں نظامِ دورانِ خون کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"نظامِ دورانِ خون دو طرح کا ہوتا ہے کھلا نظام(Open System) اور بند نظام(Close System)۔ فائیلم آرتھروپوڈا اور مولکا کے ارکان میں کھلا نظام پایا جاتا ہے۔ اس میں خون کی نالیاں نہیں ہوتیں بلکہ خون کی کھلی جگہوں یعنی جوفوں Sinuses میں پمپ کر دیا جاتا ہے۔۔۔ خون دل کے دائیں وینٹریکل(Ventrical) سے نکل کر پلمونری شریان(Pulmonary Arotery) میں سے ہوتا ہوا پھیپھڑوں میں جاتا ہے۔ یہاں خون آکسیجن جذب کرتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتا ہے۔ یہی خون واپس پلمونری ورید کے ذریعے بائیں اوریکل میں آجاتا ہے۔ بائیں اوریکل، صاف خون بائیں وینٹریکل میں پمپ کرتا ہے۔ یہاں سے، صاف خون بائیں وینٹریکل میں پمپ کرتا ہے اور یہاں سے، صاف خون شریانوں میں پمپ ہوتا ہے۔(۲۲)

مدنی کی نظموں میں بے شمار سائنسی تصورات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ نظم "روحِ باراں" کا اقتباس ملاحظہ کریں:

گریہ ابر سے جاگ اٹھے بام و در
روئی دل میں ہوا نام لے کر کوئی
چند چھینٹوں سے مہکی گلِ راہ گزر(۲۳)

گر یہ ابر سے مراد یہاں آسمان سے برسنے والا پانی یعنی بارش ہے۔ بارش کیسے ہوتی ہے، اس عمل کے پیچھے کیا محرکات ہیں، اس کی وضاحت اردو سائنس انسائیکلوپیڈیا میں یوں ملتی ہے:

آسمان سے مائع شکل میں ہونے والی ترسیب کو بارش کہا جاتا ہے۔ یہ بادلوں سے گرنے والے پانی کے قطروں پر مشتمل ہوتی ہے اگر قطرے بہت چھوٹے ہوں تو انھیں پھوار کا نام دیا جاتا ہے۔ بارش کو آبی چکر میں بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ جس کے ذریعے سمندر اور دیگر آبی ذخائر سے اٹھنے والے بخارات، بادل بن کر اونچے خطوں میں برستے ہیں یا برف کی، صورت میں پڑتے ہیں اور یہ پانی دریاؤں کی، صورت میں دوبارہ سمندر میں چلا جاتا ہے۔ (۲۴)

نظم "آخری سفر" میں شاعر نے علم کیمیا کے نکتے کو اجاگر کیا ہے۔ کیمیا سائنس کی وہ شاخ ہے جس میں مختلف عناصر آپس میں مل کر کوئی نیا عنصر بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ نظم سے اقتباس ملاحظہ کریں:

سلگ رہی ہے برابر دلوں میں آتشِ شوق
کوئی جو سکہ مقلوب ہو پگھل جائے
یہ زندگی کا مس خام کیمیا نہ بنے
دمِ جنوں سے ذرا ماہیت بدل جائے(۲۵)

سید قاسم محمود اسلامی سائنس میں علم کیمیا کے بارے میں رقم طراز ہیں:

جدید علم کیمیا میں قدرتی طور پر پائے جانے والی اشیا کی تحلیل ماہیت سے وہ عناصر معلوم ہو جاتے ہیں جو ان میں شامل ہیں اور تحلیل کمیت سے ان عناصر کا تناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان عناصر سے خود وہ اشیا اور بے شمار دوسری اشیا عمل تالیف سے بنائی جاتی ہیں۔ یہ ایسے نظری امور پر غور کا نتیجہ ہے جو مشاہدات پر مبنی ہیں۔ ان امور کی بنا پر عناصر ایک دوسرے کے ساتھ ترکیب پا سکتے ہیں اور واقعات کی رواں کی تکوین حتیٰ کہ جوہروں کی ساخت کی بھی تحقیقات کی جا سکتی ہیں۔ یہ خالص علمی تحقیق اس جستجو کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے جس کی بدولت ہم فنی (تکنیکی) ذرائع سے کام لے کر نہصرف علمی اہمیت کی اشیا حاصل کر سکتے ہیں، بلکہ ان کے مماثل نئی نئی اشیا بھی تیار کر سکتے ہیں۔ (۲۶)

نظم "کاکل وقت" خوشبوؤں کے پھیلنے کے بارے میں شاعری نے انتہائی دلکشی سے بتایا ہے۔ ہوا میں خوشبو یا بدبو پھیلنے کے عمل کو سائنسی اصطلاح میں "ڈفیوژن" کہتے ہیں۔ درج ذیل اقتباس دیکھیے:

محو نظارہ رہتی ہیں آنکھیں

پھول کھلتے ہیں، شاخیں لہکتی ہیں
وقت کی کھیتیاں خوش بوؤں سے مہکتی ہیں
تم بتاؤ کہ محرم ہو تم زندگی کے[۲۷]

خوش بو پھیلنے کے عنصر کی وضاحت اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا میں یوں درج ہے:

مارلے کے مالیکیولوں اور ایٹموں جیسے ذرات، حرارت یا مومینٹم کا زیادہ ارتکاز سے کم ارتکاز کے علاقے کی طرف حرکت کرنا نفوذ کہلاتا ہے۔ پانی سے بھرے کسی جار میں رنگ کی قلم رکھ دی جائے تو ایک خاص عرصے میں تمام پانی یکساں رنگین ہو جائے گا۔ نفوذ کے عمل میں رنگ کے مالیکیول قلم کے ایک اطراف میں رنگ کے زیادہ ارتکاز کے حاصل کم و بیش یکجان محلول بناتے ہیں۔ پودوں میں پانی کے زیادہ ارتکاز والے حصوں یعنی جڑوں سے پانی کا کم ارتکاز والے حصوں یعنی شاخوں اور تہوں میں چڑھنا بھی جزواً نفوذ ہی ہے۔[۲۸]

"کاکلِ وقت" ایک طویل نظم ہے، جس میں شاعر نے جابجا بے شمار سائنسی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے۔ سائنسی تصورات مدنی کی نظموں کا خاصا ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

روح ایٹم کی چھائی کبھی رات کا نشہ بن کر
شبستان یونانیاں کے چراغوں کی لو میں
اور خیالوں کے وہ فاصلے آ گئے راہ میں
ہو گئی رفتہ رفتہ فراقِ دوام[۲۹]

اس نظم میں سائنسی اصطلاح "ایٹم" کو اردو سائنس بورڈ میں یوں بتایا گیا ہے:

ایٹم کسی عنصر کا سب سے چھوٹا ذرہ ہوتا ہے، جو اس کے کیمیائی خصائص کا حامل ہے۔ ایٹم جن بنیادی ذرات (الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران) پر مشتمل ہے ان میں سے الیکٹران کی کمیت سب سے کم ہے اور اس پر منفی چارج ہے۔ جب کہ پروٹان پر موجود مثبت چارج ہوتا ہے اور یہ مقدار میں الیکٹران کے منفی چارج کے برابر ہے۔ پروٹان کی کمیت الیکٹران سے ۱۸۳۲ گنا زیادہ ہے۔ نیوٹران پر کوئی چارج نہیں اور اس کی کمیت الیکٹران سے ۱۸۴۶ گنا زیادہ ہے۔ نیوٹران اور پروٹان دونوں ایٹم نیوکلیس بناتے ہیں۔ اسی لیے انھیں مشترکہ نام نیوکلیون (Nucleon) دیا جاتا ہے۔ تمام عناصر کے ایٹم انہی تین ذرات سے مل کر بنتے ہیں۔[۳۰]

مادہ مختلف ایٹمز کے ملنے سے بنتا ہے۔ ایٹم مادے کی بنیادی اکائی تصور کی جاتی ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق ایٹم بھی اپنے اندر ایک پورا جہاں رکھتا ہے۔ نظم "تاکید" کا درج ذیل شعر دیکھیے:

ریگ، صحرا کی ضرب کاری
جل گئی پیاس کی زباں ساری[۳۱]

ریگِ صحرا سے مراد، صحرا کی ریتلی زمین ہے۔ ریت مادے کی ایک قسم ہوتی ہے۔ کیمسٹری کی اصطلاح میں اس کو سیلیکون کہتے ہیں اردو سائنس بورڈ انسائیکلوپیڈیا میں ریت (Sand) کی وضاحت یوں پیش کی گئی ہے:

ریت ایک چٹانی مواد ہے جو گول یا نوکیلے باریک ذرات سے مل کر بنتا ہے۔ یہ ذرات بجری سے چھوٹے اور مٹی کے ذرات سے بڑے ہوتے ہیں۔ ان کی جسامت ۰۰۶ ملی میٹر سے ۲ ملی میٹر تک ہوتی ہے۔ یہ آتشیں، اسوبی یا منقلب چٹانیں موسمی عمل میں گھستی ہیں تو ریت بنتی ہے۔ ریت کا سب سے بڑا جزو سلیکا ہے۔ جو کوارٹز کی شکل میں ہوتا ہے۔ ہیت کے بعض ذخائر کلیتاً کوارٹز کے ذرات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ تاہم ان میں فیلڈ سپار (Feld Spar) چکنی مٹی، پائروکس (Pyroxene)، ایمفی بولز (Amphiboles) اور گلو کلونائٹ (Glauconite) بھی مختلف مقدار میں موجود ہو سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریت میں مائیکا اور لوہے کے مرکبات، زرکون، ٹرملین، کورنڈم، گاونٹ اور ٹوپاز بھی نہایت خفیف مقدار میں ملے ہوتے ہیں۔[۳۲]

نظم "غروب" میں مدنی نے سائنسی اصطلاح "کشش" (Attraction) کا استعمال بڑے انوکھے انداز میں کیا ہے۔ مدنی نظم کے اشعار میں لکھتے ہیں:

تیرے محور کی ساری کشش کھو چکی
میرے ننھے سے سورج تجھے کیا خبر
سلکِ نورِ ازل | کوئلہ ہو چکی
گردشیں ہیں تری | سب بگڑتی ہوئی[۳۳]

کشاف سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات میں کشش سے متعلق یوں لکھا گیا ہے:

اس کائنات میں کسی ایک جسم کا اپنے جیسے یا مختلف قسم کے دوسرے جسم کو کھینچنے کا وہ عمل ہے جو دو اجسام کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے ہوتا ہے۔[۳۴]

ایک اور جگہ کشش قوت کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

اس کائنات میں ایک جسم کی وہ قوت جو اپنے جیسے یا مختلف قسم کے دوسرے جسم کو اپنے قریب تر لاتی ہے وہ قوت دو اجسام کو ایک دوسرے کے نزدیک تر لانے کے لیے انھیں کھینچتی ہے۔[۳۵]

عزیز حامد مدنی ایک منفرد سوچ اور ندرتِ خیال کے حامل شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں سائنسی اصطلاحات کو اس قدر دلکش انداز میں پیش کیا ہے کہ عقل حیرت میں مبتلا ہو جاتی ہے اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاعر اپنے زمینی حقائق کے ساتھ ساتھ آسمان کی وسعتوں میں پھیلے نظام سے بھی بہ خوبی واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں مدنی کی شاعری میں ان گنت سائنسی تصورات و نظریات بکھرے نظر آتے ہیں۔ نظم "کوئی شاخِ آشنا" کا اقتباس دیکھیے:

خواب و بیداری کے تیرہ فاصلوں کے درمیاں
کتنے اندیشوں کی بے حلقہ جریبیں کھول کر
ناپتا ہے اس خلا کو ایک وقتِ رائیگاں[۳۶]

جدید سائنس کے مطابق "خلا" ایک ایسی تہہ ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان موجود ہے۔ یہ تہہ دونوں جانب پیدا ہونے والی آوازوں کو مخالف سمتوں میں پہنچنے سے روکتی ہے۔ اس تہہ کی وجہ سے کہکشاؤں میں ہونے والے دھماکے، ستاروں کی توڑ پھوڑ، شہابِ ثاقب کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی آوازیں ہم تک نہیں پہنچ پاتیں۔ یہ تہہ خاص طور پر آواز کو اپنے پار جانے سے روکتی ہے۔ تعلیمی انسائیکلوپیڈیا میں اس کی وضاحت یوں بیان کی گئی ہے:

> ہماری زمین کی فضا میں روزانہ ہزاروں کی تعداد میں پتھر داخل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۹۹ فیصد ہوا کی رگڑ کے باعث جل کر ہوا ہی میں راکھ ہو جاتے ہیں اور ایک فیصد ہی زمین کی سطح تک پہنچ پاتے ہیں، یہ شہابِ ثاقب کہلاتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ انیسویں، صدی کے درمیان میں امریکہ کے ایک شہر میں ہزاروں کی تعداد میں شہابِ ثاقب کافی دیر تک زمین پر گرتے رہے، تاہم ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔[۳۷]

نظم "انتساب" کا پہلا بند ملاحظہ کریں:

ہزار درد خریدے ہیں میں نے دل کے لیے
ابھی یہ پردۂ جاں ہے کہ ایک پردۂ ساز
پر اک افق سے پلٹتی ہوئی، بکھرتی ہوئی
تجھے ہی ڈھونڈ رہی ہے ابھی مری آواز[۳۸]

مدنی نے ان اشعار میں آواز کی بازگشت کا ذکر کیا ہے۔ اس عمل میں آواز ہوا کی لہروں میں سفر کرنے کے بعد دوبارہ ٹکرا کر واپس آتی ہے۔ علم طبیعیات کی اصطلاح میں آواز کے لوٹ کر آنے کے عمل کو "بازگشت" کہا جاتا ہے۔ اردو سائنس بورڈ میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

آواز کی کسی لہر کا کسی سے پر سے منعکس ہو کر اتنی شدت اور وقت کے موزوں وقفے میں واپس منبع کی طرف لوٹ آنا کہ اسے اصل آواز سے الگ شناخت کیا جا سکے، گونج کہلاتا ہے۔ اگر آواز کی کسی لہر کی گونج سیکنڈ کے دسویں حصے میں پلٹ آئے تو انسانی کان اسے اصل لہر سے ممیز نہیں کر سکتا۔ گونج پیدا ہونے کے لیے منعکس کرنے والا جسم اور منبع کا درمیانی فاصلہ کم از کم ۱۶۰۲ میٹر ہونا لازمی ہے۔ جب کوئی آواز یکے بعد دیگرے کئی بار منعکس ہوتی ہے تو انجذابی عمل میں اس کی توانائی بہت کم رہ جاتی ہے۔ فطرت میں گونج پر مبنی کئی مظاہر موجود ہیں۔ مثال کے طور پر چمگادڑ فریکوئنسی کی آواز خارج کرتی ہے اور اپنی پرواز شکار کی تمام حکمتِ عملی منعکس ہوتی آواز کی بنیاد پر طے کرتی ہے۔ آبدوزیں 10 تا 50 ہرٹز فریکوئنسی پر کام کرنے والے صوتی آلات استعمال کرتی ہے۔ ان میں گونج کا تجزیہ کرنے کے لیے پیچیدہ الیکٹرائی سرکٹ لگائے جاتے ہیں۔ زیادہ فریکوئنسی کی صورت لہروں کو اندرونی جسمانی اعضا اور ان کے امیج حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔[۳۹]

نظم "سرما کی ایک رات" کا اقتباس دیکھیے:

گردوں سے دھواں برس رہا ہے
یہ رات ، یہ نیلگوں سا کُہرا
ویران فضا میں بس رہا ہے[۴۰]

سائنسی تحقیق کے مطابق کہا جاتا ہے کہ آسمان کا نیلا رنگ بے وجہ نہیں بلکہ سورج کی روشنیکا خاص ذرات سے ٹکرانے کی وجہ سے ہے۔ اس عنصر کو ہم اور سائنس کی دنیا انسائیکلوپیڈیا میں یوں درج کیا گیا ہے:

آسمان کی نیلگوں رنگت کا باعث فضا میں پھیلے ہوئے ذرات ہیں۔ یہ سورج کی شعاعوں کو منعکس کرتے ہیں تو ہمیں نیلے رنگ کا احساس ہوتا ہے۔ سورج کے طلوع یا غروب کا وقت آسمان کا رنگ زرد یا سرخ نظر آتا ہے کیوں کہ اس وقت سورج کی شعائیں ذرات کی بہت ہی تیز تہوں سے منعکس ہو کر آتی ہیں۔ ہوا میں انہی روشن ذرات کے باعث ہمیں دن میں ستارے نظر نہیں آتے۔ حالاں کہ وہ آسمان پر موجود ہوتے ہیں۔ رات کے وقت چوں کہ رات کے ذرات سورج کی روشنی کو منعکس نہیں کرتے اسی لیے آسمان کی رنگت سیاہ دکھائی دیتی ہے اور ستارے نظر آنے لگتے ہیں۔ ۸۸ کلو میٹر کی بلندی سے اوپر فضا میں ذرات نہیں ہوتے اس لیے آسمان سیاہ دکھائی دیتا ہے اور سورج، چاند، ستارے بیک وقت نظر آتے ہیں۔[۴۱]

نظم "اک طلوعِ شب ہے قندیلوں سے" کا شعر ملاحظہ کیجیے:

آدمی کے دل میں گرداں کہکشاں کی لہر ہے
معملوں میں اب گرہ خوردہ شعاعِ مہر ہے[۴۲]

نعمان طارق نے کہکشاں کے بارے میں اس طرح بیان کیا ہے:

یہ کہکشائیں دراصل اربوں سال پہلے دھویں کے بڑے بڑے گھومتے ہوئے بادل تھے۔ گھومنے کے عمل کے دوران ہی ان کی یہ شکل بنی اور ستارے پیدا ہوئے۔[۴۳]

سائنسی شعور کے حوالے سے اردو نظم کی درست سمت متعین کرنے میں مدنی کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نظم میں علوم کی دنیا پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں نہ صرف سائنسی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے بلکہ سائنسی اور علمی شخصیات کو بھی اپنی نظم کا حصہ بنایا اور ان کے خیالات سے استفادہ کیا۔ ان مفکرین میں سر چارلس چپلن، پروفیسر ٹائن بی، برٹرینڈ رسل، پروفیسر جولین، بکسلے، پکاسو، لینن، سقراط کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ مدنی نے بالخصوص جن سائنسی اصطلاحات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، ان میں ایٹم، ذرات، سمندر، سیاروں کی گردش، پھولوں کا کھلنا اور خوشبو کا پھیلنا، نیلگوں آسماں، قوتِ کشش، خلا، کہکشائیں، تنفس، گردشِ خوں وغیرہ شامل ہیں۔

عزیز حامد مدنی کے ہاں سائنسی حقائق پر جو واضح نظریات ملتے ہیں وہ انھیں اپنے عہد کے بہت سے شعرا سے ممتاز کرتے ہیں اور آنے والے ادوار میں بھی ان کی منفرد شناخت قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انھیں فطرت کے مظاہر سے گہری آشنائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے روایتی مضامین کے بجائے سائنسی دور کے تقاضوں کے مطابق اردو شاعری میں سائنس کو اُجاگر کیا۔

حوالہ جات

۱۔ اصطلاح www.wekipedia.com، ۴:۵۰، ۳جون ۲۰۲۱ء۔

۲۔ جمیل احمد (مرتب)، سائنسی اصطلاحات اور ان کا پس منظر (لاہور: اردو سائنس بورڈ)، ص ۱۹۹۔

۳۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، سرورق۔

۴۔ ایضاً، ص ۱۱۱۔

۵۔ محمد طاہر قادری، ڈاکٹر، مرتب: عبدالستار، اسلام اور جدید سائنس (منہاج القران پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء)، ص ۷۷۔

۶۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۸۳۔

۷۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس بورڈ، جلد ۸ (لاہور: اردو سائنس بورڈ)، ص ۱۱۵۰۔

۸۔ حمید نسیم، پانچ جدید شاعر، فضلی سنز، ۱۹۹۷ء، ص ۲۸۱۔

۹۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۸۴۔

۱۰۔ محمد نعمان طارق، تعلیمی انسائیکلوپیڈیا، (لاہور: نشریات، ۲۰۱۱ء) ۲۷۔

۱۱۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۳۳۴۔

۱۲۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا (جلد ۹)، (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۷۷۱۔

۱۳۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۴۵۵، ۴۵۶۔

۱۴۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس بورڈ، جلد ۸ (لاہور: اردو سائنس بورڈ)، ص ۱۶۸۹۔

۱۵۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۴۵۹

۱۶۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا، جلد ۷، (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۹ء)، ص ۱۲۴۲۔

۱۷۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا جلد ۲، (لاہور: اردو سائنس بورڈ)، ص ۴۱۷۔

۱۸۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۳۶۶، ۳۶۷

۱۹۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا جلد ۷ (لاہور: اردو سائنس بورڈ)، ص ۱۲۴۲۔

۲۰۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا جلد ۸ (لاہور: اردو سائنس بورڈ)، ص ۱۶۸۹۔

۲۱۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۳۸۹۔

۲۲۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا جلد ۲ (لاہور: اردو سائنس بورڈ)، ص ۲۵۷۔
۲۳۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۴۸۶۔
۲۴۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا جلد ۸ (لاہور: اردو سائنس بورڈ)، ص ۱۵۷۳۔
۲۵۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۳۶۲۔
۲۶۔ قاسم محمود، سید، اسلامی سائنس (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، س ن)، ص ۱۷۔
۲۷۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۴۳۵۔
۲۸۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا جلد ۱ (لاہور: اردو سائنس بورڈ)، ص ۲۰۲۔
۲۹۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۴۵۶۔
۳۰۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا جلد ۱ (لاہور: اردو سائنس بورڈ)، ص ۱۵۵۔
۳۱۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۰۸۔
۳۲۔ خالد اقبال یاسر، اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا جلد ۹ (لاہور: اردو سائنس بورڈ)، ص ۱۲۳۳۔
۳۳۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۱۳۔
۳۴۔ محمد اسلام نشتر، کشاف سائنسی و تکنیکی اصطلاحات (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء)، ص ۱۵۵۔
۳۵۔ ایضاً، ص ۱۵۶۔
۳۶۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۲۶۱۔
۳۷۔ محمد نعمان طارق، تعلیمی انسائیکلوپیڈیا (لاہور: نشریات، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۸۔
۳۸۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۳۳۔
۳۹۔ خالد اقبال یاسر، محمد ارشد شیرازی و دیگر، اردو سائنس انسائیکلوپیڈیا جلد ۴ (لاہور: اردو سائنس بورڈ)، ص ۶۸۶
۴۰۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۱۸۶
۴۱۔ شہزاد علی، ہم اور سائنس کی دنیا میں انسائیکلوپیڈیا، (لاہور: مشتاق بک کارنر، س ن)، ص ۷۹۔
۴۲۔ ظفر سعید سیفی، کلیات عزیز حامد مدنی (کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء)، ص ۵۹۹
۴۳۔ محمد نعمان طارق، تعلیمی انسائیکلوپیڈیا (لاہور: نشریات، ۲۰۱۱ء)، ص ۱۵۔

ماحصل

سائنس ایسا علم ہے جو کائنات فہمی اور موجودات عالم میں ہونے والے تغیرات کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ سائنس میں تجربے اور مشاہدے سے حاصل کردہ معلومات کو عقلی اور منطقی دلائل سے پرکھا جاتا ہے تاکہ کائنات اور اس سی جڑی تمام اشیا کا ادرک حاصل کیا جاسکے۔ انسانی علوم کے مختلف شعبوں میں سائنس کی بدولت نمایاں تبدیلیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ سائنس کی مختلف ایجادات اور دریافتوں نے ہمارا تصورِ کائنات بدل دیا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے انسان نے، صدیوں پرانے اور پریشان کن مسائل کا حل تلاش کر لیا ہے اور مزید کوششیں جاری ہیں۔

سائنس کے افادی پہلوؤں کا ذکر کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی نت نئی ایجادات نے انسانیت کو بہت سے فائدے پہنچائے ہیں۔ سائنس کی بدولت علم العلاج اور جراہی کی مختلف طریقے دریافت ہو چکے ہیں غذائی پیداوار کو بڑھانے کے لیے طرح طرح کی ادویات آچکی ہیں۔ بجلی کی ایجاد سے، صنعت، زراعت طب اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ریل گاڑیوں، موٹر کاروں، بحری جہازوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے زمینی فاصلہ سمٹ چکا ہے۔ ریڈیو، کمپیوٹر، ٹیلی ویژن، سمارٹ فون، آئی پیڈ اور انٹرنیٹ دنیا گلوبل ولیج بن گئی ہے۔ چند لمحوں میں معلومات ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہیں۔

عصرِ حاضر میں انسان نے خلاؤں کو تسخیر کر لیا ہے، سمندروں کی تہ تک پہنچ گیا ہے، پہاڑوں کو کاٹ کر راستے بنا لیے ہیں اور زمین میں چھپے خزانوں کو تلاش کر لیا ہے۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی بدولت ایسی ایسی ایجادات ہو چکی ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن جب سائنس خوف ناک، صورت اختیار کرتی ہے تو ایٹمی بم، بارود، جیٹ طیاروں، مسلح جہازوں، گائیڈر میزائلوں اور جدید جنگی ہتھیاروں کے ناقابلِ تلافی نقصان تک لے جاتی ہے۔ بیسویں صدی میں سائنس

کے شعوری استعمال کی سب سے ہولناک مثال عالمی جنگوں نے پیش کی جس کی تباہی و بربادی کا ازالہ تا حال ممکن نہیں ہو سکا۔ جدید سائنسی معاشرے میں انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے علم کی حد بندی کا شعور حاصل کرے۔ علم کو لا محدود حد تک پھیلاتے جانا خطرناک رجحان ہے۔ سائنس ہمیں سہولتیں دینے کے ساتھ ہم پر ذمہ داریاں بھی عائد کرتی ہے تا کہ ایک متوازن معاشرے کی تشکیل ممکن ہو سکے۔

سائنس کے اثرات زندگی کے تمام شعبوں کی طرح ادب کی دنیا کو بھی بے شمار تبدیلیوں سے مزین کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ سائنسی نظریات کی ادب میں شمولیت ہوتی گئی۔ شاعری اور نثر میں طبیعیات ، فلکیات ،ارضیات ، حیاتیات ، نباتات اور کیمیا جیسے موضوعات پر لکھا جانے لگا۔

دورِ حاضر کے انسان کے لیے ادب اور سائنس سے جڑے رہنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ موجودہ زمانہ سائنس کا زمانہ بن گیا ہے۔ اس صدی میں سائنس کے جو حیرت انگیز انکشافات ہوئے ہیں اس سے انسانی عقل دنگ رہ گئی ہے۔ سائنس کی یہ ترقی جدید دماغوں، نئی سوچوں اور سائنسی افکار کی مرہونِ منت ہے۔ سائنس اور ادب کے باہمی رشتے کا فہم حاصل کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ دونوں گروہ انسانی زندگی سے متعلق ہیں۔ عصرِ حاضر میں ان کی اہمیت سے انکار نا ممکن ہے۔

تہذیب میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن کا حیاتِ انسانی سے کوئی نہ کوئی تعلق موجود ہو۔ ریت کے ذرے سے لے کر ایٹم بم تک تہذیب کے اجزا پھیلے ہوئے ہیں۔ جدید تہذیب کے ذریعے جہاں مادی اشیا اور آلاتِ زندگی میں اضافہ ہوا ہے، وہیں انسانی فکر اور ثقافت پر اس کے نمایاں اثرات نظر آتے ہیں۔ جدید تہذیب کی خصوصیات میں معاشرتی ساخت، ثقافت، ٹیکنالوجی، شہروں کی ترقہ ، باہنر افراد اور رہن سہن کے جدید طور طریقے ہیں۔ جدید تہذیب کی عمارت انہی ستونوں پر قائم ہے۔ ادب تہذیبی و ثقافتی زندگی کے رنگوں کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ شاعری بھی ادب کا ایک اہم حصہ ہے۔ موجودہ عہد کی شاعری تخلیقی درجہ بندی کے اعتبار سے نظم اور غزل میں منقسم ہے یہ درجہ بندی محض دو اصناف تک محدود نہیں بلکہ دو الگ الگ رویوں کی عکاس ہے۔ اردو نظم کے دو اہم موڑ ہیں۔ نئی نظم اور جدید نظم۔ نئی نظم حالیؔ اور آزادؔ کے زیر سایہ پروان چڑھی، جب کہ جدید نظم جدیدیت کے سائے میں آگے بڑھی۔ یوں اردو نظم میں وجودی مسائل، تہذیبی شکست و ریخت، سماجی ناہمواریوں اور خواب ناک اذیتوں کو نظم می موضوعاتی حدود میں جگہ دی جانے لگی۔ اس طرح نظم کی مختلف اقسام منظر عام پر آئیں، جن میں آزاد نظم، پابند نظم، نثری نظم، معریٰ نظم

شامل ہیں۔ جدید فکرِ شعر و ادب میں مختلف تشبیہوں، استعاروں اور علامتوں کے ساتھ آئی ہے۔ جدید نظم کے ہراول دستے میں ن-م راشد، مجید امج، میرا جی، قیوم نظر، یوسف ظفر اور اختر الایمان کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ہر شاعر کے ہاں شعری فضا مختلف ہوتی ہے۔ جس کی تخلیق میں شاعر کا لفظی نظام، علامتیں اور حسی رویے شامل ہوتے ہیں۔ عزیز حامد مدنی کا نام ترقی پسند تحریک کے با،صلاحیت لوگوں میں نظم نگار اور غزل گو شاعر کی حیثیت سے معروف ہے۔ انھوں نے دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح روایت سے مکمل رشتہ نہیں توڑا لیکن جدت کی طرف ضرور مائل ہوئے۔ مدنی نے اپنی شاعری میں جدید سائنسی ایجادات کے ذریعے ذہنِ انسانی تہذیبی رویوں میں ہونے والی تبدیلیوں کو تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔ ان کی نظم میں لفظوں کا انتخاب تو نہیں بدلتا لیکن مفاہیم کی ایک نئی لغت سامنے آتی ہے۔ ان کی شاعری میں بڑے شہر کی زندگی اور اس کا تضاد واضح ہے۔ اس کا اظہار انھوں نے مختلف تشبیہات اور علامات کے ذریعے کیا ہے۔

بیسویں صدی تغیرات کی صدی کہلاتی ہے۔ اس، صدی میں ادبی، صورت کا ڈھانچہ از سر نو تشکیل پانے لگا تھا، جو کہ پہلی شکل و، صورت اور اظہار سے بالکل مختلف تھا۔ اس تبدیلی کے پس منظر میں دیکھا جائے تو بہت سے ایسے حالات وواقعات نظر آتے ہیں جس نے ادبی دنیا کے ساتھ ساتھ عالمی سطح پر بھی اتنے گہرے اثرت مرتب کیے کہ پہلی تصویروں کے تمام رنگوں کو مٹا کر ان پر نئے سرے سے نقش و نگار کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ چاروں طرف سے انسانیت کو مشکلات و مصائب نے گھیرا ہوا تھا۔ سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور ذہنی تنزل انتہا کو چھو رہا تھا۔ ان کا انسانیت سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ عالمی جنگوں نے ایک ایسے انسان کو جنم دیا جو بے یقینی اور عدم تحفظ کا شکار تھا۔ بے چینی، بے اطمینانی اور اضطراب کے بادل منڈلا رہے تھے۔ ان کی نظم نگاری نے شاعری کو ایک ایسی جدت سے نوازا ہے جس میں روایت کی دھیمی دھیمی مہک محسوس ہوتی ہے۔ ان کے ہاں اکثر مقامات پر روایتی علامتیں، استعارے اور تراکیب پائی جاتی ہیں لیکن فکر کی ایک نئی جہت کو منظرِ عام پر لانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ شعری ادب کے آئنے میں تخلیق اور تہذیب کے درمیان قائم رشتے کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ہر ادب پارے میں شاعر و ادیب کی شخصیت میں تہذیبی شعور کا عکس نظر آتا ہے۔ ایسا ممکن نہیں کہ کوئی مصنف اپنے معاشرے میں عصری تقاضوں کی بدولت ہونے والے تہذیبی و ثقافتی تغیرات سے متاثر نہ ہو۔ عزیز حامد مدنی نے سائنسی ایجادات کے معاشرے اور تہذیب پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو بیان کیا ہے اور جدید معاشرے کی ثقافتی اور تہذیبی زندگی کی ایک مختلف جہت کو نمایاں کیا ہے۔ معاشرتی سانچے کی تشکیل میں شاعر و ادیب ایک معمار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ معاشرتی رویوں کی نقش نگاری ایک ماہر کاریگر کی طرح کرتے ہیں۔

ایک تخلیق کار سماج کا بہترین نبض شناس ہوتا ہے اور اپنے عہد کے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، سماجی اور سائنسی افکار میں ہونے والی تبدیلیوں کو آفاقی سطح پر پیش کرنے کی، صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے سائنسی عہد میں ادبا اور شعرا کا سائنسی فکر سے قطع تعلق اختیار کرنا ممکن نہیں رہا۔

اردو شاعری کی تاریخ صدیوں پُرانی ہے۔ امیر خسرو کی پہیلیوں سے لے کر نظم کی جدید اصناف تک شاعری نے بے شمار روپ بدلے۔ وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی حالات سے ہیتی اور موضوعاتی سطح پر تبدیلیاں رونما ہوئیں، جس سے اردو شاعری میں نئے مباحث نے جنم لیا۔ شعرا کا رجحان بدلا اورانھوں نے روایتی موضوعات سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے جدید فکر اور اسلوب کو اپنایا۔ عقلیت پسندانہ رویے کی بدولت سائنسی افکار شاعری کا حصہ بن گئے اور سائنسی ایجادات اور نظریات نے انسانی فکر کو ہر سطح پر متاثر کیا۔

سائنس اور شاعری کا تعلق بیسویں صدی میں نمایاں طور پر سامنے آیا۔ سائنسی ترقی جدید ذہنوں اور نت نئی افکار کی مرہونِ منت ہے۔ ادب اور سائنس کے باہمی رشتے کا فہم حاصل کرنا انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک نے سائنس اور شاعری کے بنیادی تعلق کو سمجھتے ہوئے سائنس کی تدریس کے لیے شاعری کو موثر ذریعہ قرار دیا ہے۔ جدید عہد میں پروان چڑھنے والی زندگی کو سائنس و ٹیکنالوجی نے اپنے حصار میں لے لیا ہے۔ لہٰذا جدید نسل کے لیے مبالغہ آرائی پر مبنی شاعری کو قبول کرنا ممکن نہیں رہا۔ ان کے لیے ایسے تصورات اور نظریات پر یقین کرنا مشکل ہو گیا ہے، جو غیر منطقی اور غیر سائنسی ہوں۔

عزیز حامد مدنی ایک منفرد سوچ اور ندرتِ خیال کے حامل شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں سائنسی اصطلاحات کو اس قدر دلکش انداز میں پیش کیا ہے کہ عقل حیرت میں مبتلا ہو جاتی ہے اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاعر اپنے زمینی حقائق کے ساتھ ساتھ آسماں کی وسعتوں میں پھیلے نظام سے بھی بہ خوبی واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں مدنی کی شاعری میں ان گنت سائنسی تصورات و نظریات بکھرے نظر آتے ہیں۔

مدنی کی جمالیاتی حس نہ صرف اردو ادب کے حوالے سے معتبر ہے بلکہ عالمی ادب پر ان کا عمیق مطالعہ اس بات کا شاہد بن جاتا ہے کہ وہ اقوامِ عالم کے مسائل، پیچیدگیوں اور معاشرتی انحطاط سے باخبر ہونے کے ساتھ ہندوستانی معاشرے کے مزاج سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ عمرانی و سیاسی اقدار، انسانی تاریخ اور عقائد سے بہ خوبی واقف تھے۔

سائنسی شعور کے حوالے سے اردو نظم کی درست سمت متعین کرنے میں مدنی کے کردار کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نظم میں علوم کی دنیا پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں نہ، صرف سائنسی اصطلاحات کا استعمال کیا ہے

بلکہ سائنسی اور علمی شخصیات کو بھی اپنی نظموں کا حصہ بنایاہے۔ مدنی بالخصوص جن سائنسی اصلاحات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، ان میں ایٹم، ذرات، سمندر، سیاروں کی گردش، پھولوں کا کھلنا اور خوشبو کا پھیلنا، نیلگوں آسماں، قوتِ کشش، خلا، کہکشائیں، تنفس، گردشِ خوں وغیرہ شامل ہیں۔ عزیز حامد مدنی کی نظمیں سائنسی نظریات اور جدید اقدار سے مالا مال ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں جدت اور روایت کے بندھن کو قائم رکھا۔ جدید سائنسی اصطلاحات اورانوکھی تراکیب کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں میں ہمیں روایتی تشبیہات، استعارے اور علامتیں بھی جابہ جا نظر آتی ہیں۔

عزیز حامد مدنی کی سائنسی حسیت اور جدید شاعری سے ان کی ہمہ گیری اور وسعتِ نظری کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے جدید علوم اور نظریات کے تحت اردو نظم کو نئی جہتوں سے روشناس کروایا۔ مدنی کا کمال فکر یہ ہے کہ وہ روایت اور جدت کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ وہ روایتی افکار سے مکمل انحراف نہیں کرتے اور علوم جدیدہ سے بھی مستفید ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں جدید سائنسی نظریات کے حامی شاعر، ادیب اور سائنس دانوں کا تذکرہ ملتا ہے جن میں شیکسپیئر، ملٹن، کارل مارکس، لینن، فرائڈ، فلیمنگ، پکاسو، سرچارلس چپلن، پروفیسر ٹائن بی، برٹرینڈ رسل، نیوٹن اور آئن سٹائن کے نام شامل ہیں۔

عزیز حامد مدنی نے دنیا میں ہونے والے انقلابات کی وجہ سے سیاسی، سماجی، نظریاتی اور ادبی کشمکش کو اپنی نظموں کا حصہ بنایاہے۔ انھوں نے سائنس دانوں کے افکار و نظریات اور انکشافات و ایجادات سے اردو شاعری کو وسعت اور کشادگی عطا کی ہے۔ اسی خوبی کی بدولت ان کی شاعری عصری تقاضوں سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔

سائنس و ٹیکنالوجی کا پیچیدہ نظام انسان کو فطرت کی رنگینیوں سے دور کرتا ہے۔ اس مادہ پرستی کے دور نے انسان سے ذاتی، صفات اور اخلاقی اقدار چھین لی ہیں۔ عزیز حامد مدنی ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں جہاں سائنسی افکار تہذیبی اور اسے مل کر ایک متوازن ماحول تشکیل دیں۔ وہ ایک ایسا فلسفہ حیات چاہتے ہیں جو سائنسی ترقی کے ساتھ اخلاقی، روحانی اور آبرومندانہ زندگی کا ضامن ہو۔

عزیز حامد مدنی کے ہاں سائنسی حقائق پر جو واضح نظریات ملتے ہیں وہ انھیں اپنے عہد کے بہت سے شعرا سے ممتاز کرتے ہیں اور آنے والے ادوار میں بھی ان کی منفرد شناخت قائم کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انھیں فطرت کے مظاہر سے گہری آشنائی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے روایتی مضامین کے بجائے سائنسی دور کے تقاضوں کے مطابق اردو شاعری میں سائنس کو اُجاگر کیا۔

کتابیات

آغا، وزیر۔ اردو شاعری کا مزاج۔ لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۲۰۰۸ء۔

آغا، وزیر۔ نظمِ جدید کی کروٹیں۔ لاہور: ادبی دنیا، ۱۹۶۷ء۔

آبادی، ثاراکبر۔ شعر اور فنِ شعر۔ لاہور: جاسم پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء۔

احمد سجاد، پروفیسر۔ ادبی تحریک افکار و مسائل، نئی دہلی، قاضی پبلشرز، ۱۹۹۴ء۔

احمد دہلوی، سید۔ فرہنگ آصفیہ۔ لاہور: مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، ۱۹۷۴ء۔

اسلم، سید۔ قلب۔ لاہور: منشورات، س،ن۔

احمد، سعید۔ اردو شاعری کا سائنسی شعور۔ فیصل آباد: مقالہ برائے پی ایچ ڈی، جی سی یونی ورسٹی، ۲۰۱۱

احمد، شہزاد۔ تیسری دنیا کے مسائل اور سائنسی انقلابات۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔

امجد، رشید۔ پاکستانی ادب، روّیے اور رجحانات۔ اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۰ء۔

احمد، جمیل۔ سائنسی اصطلاحات اور اُن کا پس منظر۔ لاہور: اُردو سائنس بورڈ، ۱۹۹۴ء۔

اسلام نشتر، محمد۔ کشاف سائنسی و تکنیکی اصطلاحات۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء۔

بینا، عبدالرحمٰن۔ دیوانِ غالب۔ لاہور: دارالشعور، ۲۰۱۵ء۔

جاوید، سرور۔ اردو نظم کی عظیم روایت۔ کراچی: رنگِ ادب پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔

جمال، نجیب۔ ادب کی ترقی پسند تحریک۔ لاہور: فکشن ہاؤس، ۲۰۱۰ء۔

حنفی، شمیم۔ جدیدیت اور نئی شاعری۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

حقی، شان الحق۔ فرہنگ تلفظ۔ اسلام آباد: نیشنل بک سنٹر، ۲۰۱۲ء۔

حسین رائے پوری، اختر۔ ترقی پسند ادب۔ لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۴ء۔

حالی، الطاف حسین۔ مقدمہ شعر و شاعری۔ لاہور: عبداللہ اکیڈمی، ۲۰۰۹ء۔

درویش، صلاح الدین۔ انسان، کائنات اور سماج۔ لاہور: بیکن ہاؤس، ۲۰۱۱ء۔

زکریا ورک، محمد۔ سائنس تاریخ کے آئینے میں۔ لاہور: نیازمانہ پبلی کیشنز، س،ن۔

سیفی، ظفر سعید۔ کلیاتِ عزیز حامدمدنی۔ کراچی: اکادمی بازیافت، ۲۰۱۳ء۔

سیفی، ظفر سعید۔ عزیز حامدمدنی: فن، فکر اور فنکار۔ کراچی: سیفی پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۱۲ء۔

سعید، طارق۔ اردو ادب کا تہذیبی پس منظر۔ لاہور: طیب شمشاد پرنٹرز، ۲۰۱۵ء۔

سڈنی، محمد علی۔ فلسفہ، سائنس اور کائنات۔ دہلی: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زباں، ۱۹۹۳ء۔

سکھیرا، عبید اللہ۔ احمد ندیم قاسمی کی نظم میں سائنسی شعور۔ نقاط: ش۔ ۱۰، اکتوبر ۲۰۱۰ء۔

شفاعت، شازیہ ناہید۔ نظم جدید اور فضا اعظمی کی طویل نظم نگاری۔ کراچی: نقش پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء۔

صدیقی، ابو الاعجاز حفیظ، کشاف تنقیدی اصطلاحات، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء۔

عبد اللہ، سید، اشارتِ تنقید، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء۔

علی، شہزاد۔ ہم اور سائنس کی دنیا میں انسائیکلوپیڈیا۔ لاہور: مشتاق بک کارنر، س،ن۔

عباس، غلام۔ جدید اردو نظم میں تصورِ کائنات۔ اسلام آباد: مقالہ برائے پی ایچ ڈی، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، ۲۰۱۲ء۔

عبد الباری، ڈاکٹر۔ لکھنؤ کا معاشرتی اور ثقافتی پس منظر۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،

فاروقی، شمس الحسن۔ شعر شور انگیز۔ جلد اوّل۔ دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ۱۹۹۷ء۔

قاسم محمود، سید۔ اسلامی سائنس۔ لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب

قادری، محمد طاہر، مرتب: عبد الستار، اسلام اور جدید سائنس، منہاج القران پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء۔

گورکھ پوری، مجنوں۔ ادب اور زندگی۔ کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۸ء۔

مظہری، کوثر۔ جدید نظم: حالی سے میرا جی تک۔ نئی دہلی: مظہر پبلی کیشن، ۲۰۰۵ء۔

نقوی، جمال۔ادب، سائنس اور جمہوریت۔پہلا ایڈیشن۔کراچی: امد برادرز، ناظم آباد ۲۰۰۴۔
نعمان طارق، محمد۔تعلیمی انسائیکلوپیڈیا، لاہور، نشریات، ۲۰۱۱ء۔
ہادی حسین، ڈاکٹر۔مغربی شعریات، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۵ء۔
یاسر، خالد اقبال۔اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا (جلد ۱)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۹ء۔
یاسر، خالد اقبال۔اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا (جلد ۲)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۹ء۔
یاسر، خالد اقبال۔اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا (جلد ۳)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۹ء۔
یاسر، خالد اقبال۔اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا (جلد ۴)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۹ء۔
یاسر، خالد اقبال۔اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا (جلد ۵)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۹ء۔
یاسر، خالد اقبال۔اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا (جلد ۶)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۹ء۔
یاسر، خالد اقبال۔اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا (جلد ۶)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۹ء۔
یاسر، خالد اقبال۔اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا (جلد ۸)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۹ء۔
یاسر، خالد اقبال۔اردو سائنس انسائیکلو پیڈیا (جلد ۹)، لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۲۰۰۹ء۔

برقی ماخذات:

اقبال اور سائنس www.Daanish.pk، ۲۰۲۱
اصطلاح ۲۰۲۱ Ur.m.wikipedia-org
احمد جاوید کے لیکچر http:/youtube/aqnrvoZbUIK

ارضیات Ur.m.wikipedia.org، ۲۰۲۱

جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد (https://daily Pakistan.com.pk/Columnist/711

ریاضی Ur.m.wikipedia.org، ۲۰۲۱

سائنس Ur.m.wikipedia.org، ۲۰۲۱

سائنس اور ادب www.sangatagacademy.net.cms

طبیعیات Ur.m.wikipedia.org، ۲۰۲۱

کیمیا Ur.m.wikipedia.org، ۲۰۲۱

نفسیات Ur.m.wikipedia.org، ۲۰۲۱